اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

فروری ۲۰۲۱ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

دینی مدارس کے نئے وفاق کی ضرورت

حکومت نے دینی مدارس کے نئے وفاق بنانے کی اجازت دے دی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دینی مدارس کا نیا وفاق بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ بات ہم حکومت کی حمایت یا مولانا فضل الرحمن کے بغض میں نہیں کہہ رہے اور نہ موجودہ دینی وفاقوں کو خدانخواستہ نقصان پہنچانا ہمارا مقصد ہے بلکہ یہ ایک تنظیمی معاملہ ہے۔

ہم پچھلے تیس سال سے مدارس کی اصلاح کی بات کر رہے ہیں، تجدد کے مخالف ہیں اور مدارس کی اسلاف کی طے کردہ قدیم روایت کی بحالی کے حامی ہیں۔ فرقہ واریت کم کرنا اور نصاب پر علماء کرام کے زیر نگرانی نظر ثانی کرنا تاکہ تعلیمی ثنویت کا خاتمہ ہو، مسلم معاشرے کی عصری ضرورتیں پوری ہوسکیں اور فارغ التحصیل علماء کرام جدید فتنوں اور افکار ضالہ خصوصاً مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب سے واقف ہوں، پیش نظر ہے۔ یہ کام دینی مدارس کے ثقہ، محقق، تجربہ کار اور معتدل مزاج علماء کرام کے زیر نگرانی ہونا چاہیے۔

تحریکِ اصلاحِ تعلیم (ٹرسٹ)

موبائل/ واٹس ایپ:0300-4354673 (ڈاکٹر محمد امین)
ای میل: amin.alburhan@gmail.com

مندرجہ ذیل کتابوں کے کچھ نسخے ادارے میں دستیاب ہیں۔
خریدنے کے خواہش مند حضرات رابطہ فرمائیں:

ترکِ رذائل احمد جاوید (مرتب: ڈاکٹر محمد امین)
صفحات: ۲۹۲ قیمت: ۳۵۰ روپے (بغیر ڈاک خرچ)

حقیقتِ تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً) ڈاکٹر محمد امین
صفحات: ۶۲ قیمت: ۸۰ روپے (بغیر ڈاک خرچ)

تعلیمی ادارے اور کردار سازی ڈاکٹر محمد امین
صفحات: ۱۷۲ قیمت: ۲۰۰ روپے (بغیر ڈاک خرچ)

مکتبہ البرہان
A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور
فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@outlook.com

ماہنامہ

البرہان

لاہور

جلد ۲۵، شمارہ ۲، فروری ۲۰۲۱ء/ جمادی الثانی ۱۴۴۲ھ

مشمولات

فکر و نظر		
افکارِ تازہ	مدیر	۴
تعلیم و تربیت		
۔نئی تعلیمی پالیسی میں اقلیتوں کا کردار	پروفیسر ملک محمد حسین	۸
۔سائنس کی اسلامائزیشن ممکن نہیں	ڈاکٹر زاہد صدیق مغل	۱۱
۔دینی مدارس کے وفاقوں کے تنظیمی مسائل	عبداللہ میر	۱۶
تفہیم مغرب		
کرسپر ٹیکنالوجی	ڈاکٹر محمد رضوان	۲۳
دینی تحریکیں		
ایک ہمہ جہت نئی دینی اصلاحی تحریک کی ضرورت	ڈاکٹر محمد امین	۳۶
مطالعۂ کتاب		
'پاکستان کی دینی قوتیں غیر موثر اور ناکام کیوں؟'	ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری	۵۱
تبصرۂ کتب		
'جماعت اسلامی ۔کل اور آج'	مدیر	۵۸

مدیر: ڈاکٹر محمد امین

نائب مدیر: پروفیسر ملک محمد حسین

انچارج سرکولیشن

(0309-4607124)

[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 45 روپے

سالانہ 500 روپے۔ پانچ سال: 2000 روپے

تاحیات 10,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ

سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور

A/c # 02011478219

برائے رابطہ

97-A نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور 54700

ادارتی امور

ermpak@outlook.com

برائے آن لائن مطالعہ

www.alburhanmonthly.org

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف

0306-4640366

فکرونظر

افکارِ تازہ

* ایک ہمہ جہت نئی دینی اصلاحی تحریک کی ضرورت
* اگلے الیکشن سے پہلے نئی سیاسی جماعت کے ابھرنے کا امکان اور اسٹیبلشمنٹ کا کردار
* ایک نئی دینی سیاسی جماعت کا قیام ناگزیر ہے

یہ تحریر ان لوگوں کے لیے خرد افروز ثابت ہو سکتی ہے جو روٹین سے ہٹ کر سوچ سکتے ہیں اور 'سٹیٹس کو' میں یقین نہیں رکھتے۔

ایک ہمہ جہت نئی دینی اصلاحی تحریک کی ضرورت

ہم نے تھوڑا عرصہ پہلے ایک کتاب شائع کی تھی جس کا عنوان تھا ''پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں۔ایک فکری تجزیہ''۔اس میں ہم نے کہا تھا کہ برصغیر کی مسلم دینی قوتوں نے سقوط خلافت اور مسلم علاقوں پر مغربی فکر وتہذیب کے علمبردار ممالک کے استیلاء کے بعد تعلیم، تبلیغ، تصوف اور سیاست کے شعبوں میں جو اجتہادی لائحہ عمل اپنایا وہ اکثر صورتوں میں فکری لحاظ سے کمزور تھا اور اب تقریباً ایک صدی کے تجربے نے اس لائحہ عمل کا ناقص اور غیر مؤثر ہونا عملاً بھی ثابت کر دیا ہے لہٰذا نقل وعقل دونوں کا تقاضا ہے کہ اس صورتِ حال کی اصلاح کی جائے اور ان شعبوں میں کام کی نئی حکمت عملی وضع کی جائے اور ان دو کاموں کے لیے ایک نئی اور ہمہ جہت دینی اصلاحی تحریک شروع کی جائے۔ہم نے کتاب کے آخری باب میں مجوزہ اصلاحی تحریک کے بارے میں اپنی تجاویز بھی قارئین کے غور وفکر کے لیے طبع کر دی تھیں۔

ہم نے البرہان کے اس شمارے میں اس کتاب کی تلخیص شائع کر دی ہے۔جن قارئین کو ہماری فکر سے اتفاق ہو ان سے درخواست ہے کہ وہ ہم سے رابطہ فرمائیں اور جن کو اس سے اختلاف ہو، ان سے درخواست ہے کہ وہ اس پر نقد کریں۔ہم اسے البرہان میں شائع کریں گے، ان شاء اللہ۔

اگلے الیکشن سے پہلے نئی سیاسی جماعت کے ابھرنے کا امکان اور اسٹیبلشمنٹ کا کردار

یہ ایک حقیقت ہے کہ تحریک انصاف کی حکومت ڈیلیور نہیں کر پائی اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اپوزیشن اسے ہٹانے کے لیے متحد اور متحرک ہوگئی ہے۔ اگر حکومت اسٹیبلشمنٹ کی مدد کے باوجود اپوزیشن کو دبانے میں کامیاب نہیں ہوتی تو آئینی طریقہ یہی رہ جاتا ہے کہ قبل از وقت انتخابات ہوں۔ اور اگر حکومت اسٹیبلشمنٹ کی مدد سے اپوزیشن کو دبانے میں کامیاب ہوجاتی ہے تو اس کے باوجود اگلے الیکشن میں بری کارکردگی کی وجہ سے تحریک انصاف کے جیتنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہوں گے اور دوسری سیاسی جماعتیں اسٹیبلشمنٹ کے ویسے ہی خلاف ہیں تو اسٹیبلشمنٹ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا کہ ایک نئی سیاسی جماعت بنوائی جائے، اس میں Electables جمع کیے جائیں، اسے مقبولیت دلوائی جائے اور اسے کامیاب کرایا جائے۔

ہم پاکستان کے موجودہ سیاسی جمہوری نظام کو غیر اسلامی اور مغرب کی لادین سرمایہ دارانہ جمہوریت کا چربہ سمجھتے ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اس کے ذریعے ملک میں کبھی اسلام نہیں آسکتا بلکہ عملاً اس کی وجہ سے مغربی فکر و تہذیب کے غیر اسلامی نظریات و اقدار ہمارے ہاں غالب آچکی ہیں لہٰذا ہمارے نزدیک اس میں حصہ لینا محض ایک مجبوری اور ناگزیر برائی ہے۔ سیاستدانوں کے بودے کردار اور ملکی سلامتی کے تقاضوں کے پیش نظر ہمیں اس جمہوریت میں اسٹیبلشمنٹ کے کردار پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ ہمیں اعتراض اس بات پر ہے کہ اسٹیبلشمنٹ کو بھی محض پاکستان سے دلچسپی ہے، اسلامی پاکستان سے نہیں۔ یہی اعتراض ہمیں پاکستان کی سیاسی جماعتوں پر بھی ہے کہ انہیں صرف اپنے اقتدار سے دلچسپی ہے، اسلامی پاکستان سے نہیں۔

لہٰذا ہم اسٹیبلشمنٹ کے کارپردازوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ اگر انہیں پاکستان کے سیاسی نظام اور حالات کے بارے میں مجبوراً دلچسپی لینا ہی پڑتی ہے تو وہ ''As it is'' کی بجائے ''As it ought to be'' کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے؟ مطلب یہ کہ پاکستان کا سیاسی نظام جس طرح سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور چند سیاسی خاندانوں میں جکڑا ہوا ہے، اور وہ الیکٹیبلز بنے ہوئے ہیں، اسے ان سے آزاد کرائیں اور غریبوں اور متوسط طبقے کی

صاحب کردار قیادت سامنے لائیں۔ اس سے ان کا دردِ سر بھی کم ہوگا اور عوام کے زخموں پر بھی کچھ مرہم لگے گا اور ان کے کچھ مسائل بھی حل ہوں گے تو وہ آپ کو دعائیں دیں گے۔

یہ بات بھی اسٹیبلشمنٹ کے سوچنے کی ہے کہ اب جبکہ بین الاقوامی حالات انہیں چین اور روس سے قریب ہونے پر مجبور کر رہے ہیں تو وہ امریکہ و یورپ کی غلامی سے جان چھڑائیں اور چین و روس سے تعلقات بڑھاتے وقت بھی اپنے نظریاتی اور قومی مفادات کا تحفظ کریں۔ اور آخری بات یہ.... اور یہ سب سے اہم ہے کاش وہ اس پر سوچیں.... کہ قوموں کی بقاء اور ترقی کا انحصار ان کے اساسی نظریات سے ان کی وابستگی پر ہوتا ہے۔ لہٰذا پاکستان کی بقاء، استحکام اور ترقی کا انحصار اسلام سے اس کی وابستگی پر ہے اور اس امر پر فوکس کیے بغیر جو بھی کوششیں پاکستان کی سر بلندی کے لیے کی جائیں گی وہ مؤثر اور مفید ثابت نہ ہوں گی۔

ایک نئی دینی سیاسی جماعت کا قیام ناگزیر ہے

پاکستان کی موجودہ دینی سیاسی جماعتیں غیر مؤثر اور ناکام ہو چکی ہیں۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی ایک تصورِ دین پر متفق و متحد نہیں۔ ہر دینی سیاسی جماعت صرف اپنے مسلک اور صرف اپنی تعبیرِ دین کو ہی صحیح سمجھتی ہے، حق کو اس میں محصور سمجھتی ہے اور اس کے لیے وہی عصبیت رکھتی ہے جو دین اسلام کے لیے رکھنی چاہیے۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ مغربی قوتیں اور ان کے زیر اثر پاکستانی حکمران اشرافیہ اور خفیہ ادارے ان دینی سیاسی جماعتوں کو آپس میں لڑاتے ہیں اور ان کی ہوا خیزی میں کامیاب ہیں۔ نیز کئی دینی سیاسی رہنما اپنے سیاسی اور ذاتی مفادات کے لیے سیکولر سیاسی جماعتوں اور اسٹیبلشمنٹ سے مل جاتے ہیں۔ افراد کی اسلامی تربیت اور عوامی مسائل کے حل کے لیے بھی دینی سیاسی جماعتیں کوئی مؤثر حکمت عملی نہیں اپنا سکیں۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں اپنا ووٹ بنک کھو چکی ہیں۔ مسلمان عامۃ الناس علماء کی مسجد و مدرسہ کی خدمت اور معاشرے کے دینی رسوم و رواج میں شرکت کی وجہ سے ان کی عزت ضرور کرتے ہیں لیکن ان کو ووٹ نہیں دیتے۔ مزید ستم یہ کہ ہماری دینی سیاسی جماعتیں اس صورتِ حال سے سبق سیکھنے اور اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کرنے کے لیے تیار نہیں۔

ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ایک نئی دینی سیاسی جماعت اٹھے جو ان مذکورہ خامیوں سے پاک ہو اور مندرجہ ذیل خطوط پر کام کرے:

وہ جمہور کے اسلام اور اسلام کے متفق علیہ مشترکات پر اٹھے (نہ کہ کسی خاص مسلک اور تعبیرِ دین پر)، افراد کی اسلامی تربیت کرے، ان کے اجتماعی مسائل حل کرے اور معاشرے کے مسائل اسلامی تناظر میں حل کرنے کے لیے ہی اقتدار میں آنے کے لیے سیاسی جدوجہد کرے۔ یہ جماعت اور اس کی قیادت صرف علماء پر مشتمل نہ ہو بلکہ یہ معاشرے کے سارے طبقات، پروفیشنلز اور غریب و متوسط طبقے کو اپنی اساس بنائے۔ یہ سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور معاشرتی و معاشی برائیوں کے خلاف مزاحمت کرے اور غریب، پسماندہ اور پسے ہوئے طبقات کو اٹھائے۔

اور یہ جدوجہد وہ موجودہ جمہوریت کو ناگزیر برائی سمجھ کر عارضی طور پر کرے اور اس کا اصل ہدف یہ ہو کہ وہ عصر حاضر میں اسلام کے سیاسی نظام کا نقشہ اسلامی اور سیاسی علوم کے ماہرین سے تیار کروائے اور اسے ملک میں نافذ کرنے کی کوشش کرے۔

ہمیں یقین ہے کہ اگر ان خطوط پر سیاسی جدوجہد کی جائے تو کامیابی قدم چومے گی اور اللہ تعالیٰ کی نصرت بھی شامل حال ہوگی اور ریاستی قوت کو اسلام کے لیے استعمال کیا جاسکے گا تاکہ مسلمان دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب ہوسکیں۔

هذا من عندنا والعلم عند الله.

قارئین توجہ فرمائیں

البرہان کے خریدار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ سالانہ زر اعانت مبلغ پانچ سو روپے ادارے کو بذریعہ منی آڈر، بنک اکاؤنٹ (سونیری بنک لمیٹڈ، اکاؤنٹ نمبر 02011478219) موبی کیش (0306-4640366) ارسال فرمائیں اور ادارے کے مالی بوجھ میں شرکت فرما کر اس مشن کو جاری رکھنے میں ہماری اعانت فرمائیں۔

(انچارج سرکولیشن)
محسن یوسف
0309-4607124

تعلیم وتربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

تعلیم ـ سیکولر لابی اور اقلیتوں کا کردار

پاکستان کا موجودہ نظامِ تعلیم پہلے بھی اسلامی نہیں ہے اور اس میں وہ اسلامیت اور مشرقیت بھی نہیں رہی جو ہمیں ۱۹۴۷ء میں انگریزوں سے ورثے میں ملی تھی۔ عربی فارسی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی، صبح کی اسمبلی میں تلاوتِ قرآن حکیم بھی ہوتی تھی اور علامہ اقبال کی دعائیہ نظم ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' بھی پڑھی جاتی تھی اور شاید بعض سکولوں میں نماز کا اہتمام بھی ہوتا تھا لیکن اب آہستہ آہستہ نہیں بڑی تیزی کے ساتھ لبرلزم اور سیکولرزم کی یلغار تعلیمی اداروں پر نازل ہو رہی ہے۔ موجودہ حکومت نے پہلے سنگل نیشنل کریکولم کے نام پر ایک ایسا نصاب بچوں کے ذہنوں پر تھوپنے کی کوشش کی جو سیکولر اداروں کے نام نہاد ماہرین، بیرونی مشیروں اور بیرونی فنڈز سے چلنے والی این جی اوز کے کارپردازوں سے بنوایا گیا اور اس نصاب میں ہیومنزم کی خدا منکر اقدار کو سمونے کی کوشش کی۔ ملک کے محب وطن ومحب اسلام اداروں، ماہرین تعلیم اور قابل اساتذہ کو مکمل نظرانداز کیا گیا۔ ریاست اور سیکولر میڈیا کے زور پر پروپیگنڈا کیا گیا کہ حکومت بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے رہی ہے۔

'البرہان' نے اپنے متعدد اور متنوع مضامین کے ذریعے حکومتی دعووں کا پردہ چاک کیا اور محب وطن حلقوں کو جگانے کی کوشش کی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ اس سیکولر اور لبرل نصابی حملے کے باوجود اسلام دشمن لابی مطمئن نہیں ہوئی اور انگریزی پریس میں یہ مطالبہ کرتے ہوئے مضامین کا طوفان کھڑا کیا کہ اسلامیات کا نصاب تو دینی مدارس سے بھی بڑھ کر ہے اور یہ کہ اس سے انتہاپسندی اور تشدد پرستی کو فروغ ملے گا۔ مقصد یہ تھا کہ باقی سارا نصاب تو مغرب زدہ کر دیا گیا ہے، ساتھ ہی اسلامیات کے نصاب کا خاتمہ بھی کرا دیا جائے حالانکہ اسلامیات کا نصاب تو اتنا بھی نہیں ہے جتنا پہلے سے سکولوں میں رائج ہے۔ اُس وقت یعنی ایک سال پہلے سیکولر، لبرل اور عیسائی تنظیموں کے کارپردازان نے اسلام آباد میں ایک دھواں دھار سیمینار منعقد کیا جس میں وفاقی وزیر تعلیم کو سامنے بٹھا کر اقلیتوں کے تعلیمی حقوق کی دہائی دی گئی۔ نتیجتاً وفاقی وزیر تعلیم نے اعلان کیا کہ نصاب اور درسی کتب میں سے اسلامی تصورات کو نکال دیا جائے گا اور سیمینار کی سفارشات کو من وعن تسلیم کر لیا اور نہ صرف تسلیم کیا بلکہ ماڈل درسی کتب تیار کرتے ہوئے پوری طرح خیال رکھا گیا کہ اقلیتوں کے حوالے سے جو سفارشات پیش کی گئی

تھیں ان پر عمل کیا جائے۔

اب حکومت نے قومی تعلیمی پالیسی تیار کرنے کا اعلان کیا ہے۔ یہ بھی طرفہ تماشا ہے کہ سنگل نیشنل کریکولم کے نام سے نصاب پہلے تیار کیا گیا اور قومی تعلیمی پالیسی اب حکومت کے برسر اقتدار آنے کے اڑھائی سال بعد تیار کرنے کا مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی کی تیاری بھی ایک فراڈ معلوم ہوتا ہے کیونکہ پالیسی تیار کرنے کے لیے جو تحقیقی لوازمات ہونے چاہئیں اور جتنا وقت درکار ہوتا ہے اس کا کوئی نام و نشان نظر نہیں آتا۔ دسمبر کے آخر میں اعلان کیا گیا، جنوری میں لوگوں سے تجاویز مانگی گئیں۔ ۷ فروری کو ڈرافٹ پالیسی کے اعلان کا وعدہ کیا گیا اور ۲۳ مارچ کی پالیسی کے حتمی اعلان کی تاریخ دی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے اپنے بیرونی کرم فرماؤں سے پالیسی ڈاکومنٹ لکھوالیا ہے، بس کچھ رسمی کارروائیوں کے بعد اسے اعلان سے سرفراز کر دیا جائے گا۔ حکومت کے تعلیمی پالیسی تیار کرنے کے اعلان کے بعد وہ سیکولر، لبرل گروپ پھر متحرک ہو گیا ہے جو پچھلے سال نصاب کی تدوین کے وقت متحرک تھا۔ ۱۵ جنوری کو اسلام آباد میں ایک سیمینار منعقد کیا گیا جس میں وہی معروف سیکولر لوگ یعنی اے ایچ نیر، یعقوب بنگش، طاہرہ عبداللہ، انجم جیمز پال، ابراہام مراد.... وغیرہ شامل تھے۔ ایک صاحب جنہوں نے اپنی شناخت ظاہر نہ کرنے کی درخواست کی ہے، اس سیمینار کی مختصر سی رپورٹ دی ہے۔ رپورٹ ملاحظہ فرمائیں:

''۱۵ جنوری کو اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں ایک کانفرنس تعلیم، نصاب اور نئی قومی تعلیمی پالیسی پر منعقد ہوئی۔ مقصد یہ تھا کہ نئی قومی تعلیمی پالیسی میں اقلیتوں کے مطالبات شامل کرائے جائیں۔ کانفرنس کے منتظمین اور مقررین میں اقلیتوں کے نمائندوں کے ساتھ ساتھ سیکولر دانشوروں کا بھی غلبہ تھا جو اقلیتوں کے کندھے پر بندوق رکھ کر دینِ اسلام اور تاریخ پاکستان کے اہم نکات کو نصاب سے خارج کرنے پر زور دے رہے تھے۔ اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ سوائے اسلامیات کے باقی تمام مضامین سے دینی حوالوں کو نکال دیا جائے۔ تاریخ کے مضمون میں محمد بن قاسمؒ، محمود غزنویؒ، طارق بن زیادؒ اور صلیبی جنگوں کا ذکر نہ ہو۔

۲۔ اردو کے نصاب میں سیرت نبوی، طب نبوی، اسوۂ حسنہ وغیرہ اور تاریخ اسلامی کے مشاہیر اور ہیروز کے متعلق اسباق کو خارج کر دیا جائے۔

۳۔ گارڈن کالج راولپنڈی اور دیگر پچاس سے زائد تعلیمی ادارے جو انگریزوں کے دور

میں مشنریز نے بنائے ان کا کنٹرول چرچ آف پاکستان کے حوالے کیا جائے۔

۴۔ یعقوب بنگش نامی مقرر نے مقالہ پیش کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ مشنریز کے قائم کردہ اداروں کے باعث پاکستان میں تنقیدی سوچ پروان چڑھی، سائنس کا ارتقاء ہوا۔

۵۔ پشاور سے شرکت کرنے والے بشپ نے کہا کہ ایڈورڈز کالج کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کرسمس کی تقریب نہیں ہوسکی اور یہ کہ ایڈورڈز کالج کا مسیحائی تشخص حکومت تبدیل کر رہی ہے۔

۶۔ مقررین کی تقاریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اقلیتوں کے کچھ سرگرم ماہرین تعلیم کو وفاق اور پنجاب کی درسی کتب کی کمیٹیوں میں شامل کیا گیا ہے اور وہ درسی کتب سے اسلام اور تاریخ اسلام کے اسباق کو خارج کرانے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔‘‘

مذکورہ کانفرنس میں اور بھی بہت کچھ کہا گیا جن میں کئی باتیں ناگفتنی ہیں اور ان کا ذکر نہ ہی کیا جائے تو بہتر ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقلیتوں کے نام پر سیکولر لبرل طبقہ جو طوفان کھڑا کر رہا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ ملک میں اقلیتوں کی آبادی ۳ فیصد سے بھی کم ہے جس میں ایک اندازے کے مطابق ایک فیصد تو قادیانی ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں (اگرچہ پاکستان کے آئین اور اسلام کے واضح اصولوں کے مطابق وہ غیر مسلم ہیں) اور انہیں نصاب تعلیم میں اسلامی تصورات پر بظاہر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ عیسائیوں کی آبادی ایک فیصد کے قریب ہے اور باقی تمام مذاہب بشمول ہندو، سکھ، پارسی وغیرہ مل کر ایک فیصد بنتے ہیں۔ اب ان دو فیصد کی بات تو سیکولر لبرل لابی کے لوگ زور شور سے کرتے ہیں اور ۹۷ فیصد مسلمانوں کے تعلیمی، مذہبی حقوق ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ ملک میں بیرونی ایجنڈے پر کام کرنے والے دس لاکھ میں ایک کی تعداد میں موجود سیکولر لبرل لابی کے گماشتے چونکہ شور مچانے میں شیر ہیں اور بیرونی فنڈنگ سے انصاف ہوتا بھی دکھانا چاہتے ہیں اس لیے اقلیتوں کے نام پر دباؤ ڈالتے ہیں۔ خود عیسائی اقلیتی گروپوں میں بھی مغربی عیسائی دنیا کے گماشتے موجود ہیں جنہیں مالی امداد اور سفارتی پشت پناہی بھی حاصل ہوتی ہے تو وہ بھی اپنا رزق حلال کرنے اور کچھ اپنی اقلیتوں کے مفادات کے پیش نظر متحرک رہتے ہیں۔ اس طرح ایک ماحول پیدا کر دیتے ہیں۔ پچھلے سال کے اقلیتی سیمینار اور ۱۵ جنوری کے سیمینار میں موجود وفاقی وزارتِ تعلیم کے نمائندوں نے ان سیمیناروں کے مطالبات کے سلسلہ میں مثبت بیانات دیے اور پھر جو دعوے کیے ان پر عمل بھی کیا جس کا ثبوت سنگل نیشنل کریکولم اور ماڈل درسی کتب ہیں۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۳۵)

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر زاہد صدیق مغل (۱)

سائنس کی اسلامائزیشن ممکن نہیں
کیونکہ اس کی علمیاتی بنیادیں اسلام مخالف ہیں

سائنس اور سرمایہ داری کا تعلق حادثاتی نہیں

سائنسی علمیت کو سرمایہ دارانہ نظام اور خواہشات انسانی کی تکمیل کے لیے سرگرم ذہنیت کی پیداوار سمجھنا کوئی بے بنیاد تصور نہیں اور نہ ہی اس کا انسانی خواہشات کی تکمیل اور سرمایے میں اضافے کی جدوجہد میں مصروف ہونا کوئی حادثہ ہے کہ جسے بدلنا ممکن ہو۔ بلکہ یہ عین سائنسی معنویت کا اظہار ہے اور علم کو اس کی معنویت سے جدا مقصود کرنا بلاشک وشبہ ایک مہمل دعویٰ ہے۔ اصول فقہ کے درست استعمال سے شارع کی رضا معلوم ہوجانا کوئی حادثہ نہیں، علم تصوف کے غلبے سے نفسانی خواہشات کا کم ہوجانا کوئی حادثہ نہیں، بالکل اسی طرح سائنس کا سرمایہ داری کی خدمت کرنا کوئی حادثہ یا سازش نہیں بلکہ سائنس عین اسی چیز کو ممکن بناتی ہے اور پچھلی تین سو سالہ انسانی تاریخ یہی ثابت کرتی ہے کہ جن معاشروں میں سائنسی علمیت غالب ہوئی وہاں حرص وحسد، نفس پرستی، حب دنیا، حب مال وغیرہ ہی کی اقدار پختہ ہوئیں۔ سائنس وٹیکنالوجی کسی خلا میں تخلیق نہیں ہوتیں اور نہ ہی یہ آسمان سے من وسلویٰ کی طرح برستی ہیں بلکہ انسانی تعلقات کے ایک مخصوص نظم معاشرت ہی میں ان کی تخلیق، تشکیل وترویج ممکن ہوتی ہے۔ علم معاشیات کی زبان میں اسے کہا جاتا ہے کہ ٹیکنالوجی سرمایہ دارانہ پیداواری نظم کے باہر سے نہیں بلکہ اس کے اندر سے برآمد ہوتی ہے۔ ہائیک، لبرل سرمایہ داری کا موجودہ سب سے بڑا حامی اس بات کو یوں کہتا ہے کہ سائنسی علم سرمایہ دارانہ نظم معاشرت یعنی مارکیٹ (جسے وہ Catalaxy سے تعبیر کرتا ہے) کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ ماؤزے تنگ، اشتراکی سرمایہ داری کا چیمپئن برملا کہتا ہے کہ سائنسی علم پیداواری عمل سے برآمد ہوتا ہے۔ سائنس کا سرمایہ داری سے تعلق مغرب کے تمام نامور مکتبہ ہائے فکر کے ہاں بالکل واضح ہے۔ حامیانِ سائنس مسلم مفکرین کسی علمی منہج کی بجائے دوسرے اور

---

(۱) پروفیسر اکنامکس، NUST اسلام آباد

تیسرے درجے کے مغربی مصنفین کی تحریروں پر اکتفا کرتے ہیں لہٰذا سائنس پر ان کا تجزیہ سطحی اور عامیانہ ہی رہتا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص اسلامی علمیت سے واقفیت کے لیے فقہ واصول فقہ وغیرہ کی امہات الکتب کی بجائے اردو کی چند کتابیں یا دور جدید میں لکھنے والے چند مفکرین کو پڑھ کر اسلام کے بارے میں کوئی رائے قائم کرے۔

یہ دعویٰ کہ سائنس اور اسلام کے درمیان تعلق مفاہمت کا ہے، وہی شخص کر سکتا ہے جس کی نظر فلسفہ سائنس پر نہ ہو اور وہ سائنس کو ایک غیر اقداری علم تصور کرنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ سائنس محض غور وفکر کا نام نہیں بلکہ ایک مخصوص ذہنیت کے ماتحت غور وفکر کا نام ہے۔ کسی شے کے بارے میں غور وفکر کی نوعیت اور مقدار کا تعین اس بات سے ہوتا ہے کہ غور وفکر کرنے والے شخص کی مابعد الطبیعیات اور مقصد کیا ہے؟ سائنس کوئی ہتھوڑی نہیں کہ جسے جو چاہے، جیسے مرضی استعمال کر لے بلکہ یہ ایک علمیت ہے اور ہر علمیت ایک مخصوص مقصدیت وعقلیت کی حامل ہوتی ہے۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے معتبر غور وفکر وہ ہے جس کا مآل کار ''عبرت واسلامی اصلاح'' ہو نہ کہ تسخیر کائنات اور انسانی ارادے کا تسلط قائم کرنے کی خواہش۔ درحقیقت ہر علمیت کامیاب زندگی کے ایک مخصوص تصور کو ممکن بنانے کا طریقہ کار وضع کرتی ہے اور تصور کامیابی کے مابعد الطبیعیاتی تناظر میں تبدیلی کے بغیر کسی معاشرے میں ایک علمیت کے بجائے کسی دوسری علمیت کا غالب آجانا ممکن ہی نہیں۔ مثلاً علم تصوف محض چند معلومات کا مجموعہ نہیں بلکہ نفس انسانی کو ارادۂ الٰہی کے سپرد کر دینے پر تیار کرنے کی علمیت ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی معاشرے میں تصوف کا غلبہ ہو لیکن افراد دنیا پرست اور خواہشات کے اسیر ہوں۔ علم تصوف کے غلبے سے وہی شخصیت برآمد ہو سکتی ہے جس کا نقشہ احادیث کی کتب ''الرقاق'' اور ''الزہد'' میں پیش کیا گیا ہے۔ اگر سائنس محض تاریخ انسانی کا تسلسل ہے اور اسلام اور سائنس کے درمیان تعلق مفاہمت وہم آہنگی کا ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ سائنس کا تصور کامیابی بھی وہی ہے جسے اسلام کامیابی کہتا ہے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ سائنس کے کامیاب زندگی کے تصور میں رضائے الٰہی اور زندگی بعد الموت کا حوالہ سرے سے مفقود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی سائنسی مضمون بشمول فزیکل اور سوشل سائنسز میں گناہ، موت، معنویت موت اور زندگی بعد الموت کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ سائنسی علمیت میں زندگی بعد الموت کے حوالے کے بغیر اسلام کے تصور کامیابی کو سائنس میں تلاش کرنا خوش فہمی تو ہو سکتا ہے مگر کوئی علمی کاوش نہیں۔ یہ تو ہوئی نظریاتی بات، اس فرق کو عملی زندگی میں دیکھنا ہو تو یورپ اور امریکہ نہ

جائیے، پاکستان کے سرکاری ونجی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جا کر سائنس اور ٹیکنالوجی، سوشل سائنسز اور بزنس اور بزنس ایڈمنسٹریشن وغیرہ کے طلبہ کے ساتھ چند دن گزار آئیے آپ کو یقین ہو جائے گا کہ ان علوم میں سرائت کی ہوئی سرمایہ داری نے کس طرح طلبہ کو اپنے شکنجے میں کس لیا ہے۔ آخر دونوں نظام ہائے علم سے دو متضاد قسم کی شخصیتیں کیوں وجود میں آتی ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ سائنسی علمیت کے نتیجے میں اسلامی شخصیت وقوع پذیر نہیں ہو پاتی؟ کیا سائنس وٹیکنالوجی کی بالادستی پر قائم ہونے والے نظام علم کی دنیا میں اپنی زندگی کے پندرہ سال گزارنے کے بعد ایک طالب علم میں للّٰہیت، محبتِ رسول ﷺ، شوقِ عبادت، طہارت، تقویٰ، خوفِ آخرت، عفت، حیا، غیرت، ایثار، شوقِ شہادت، توکل، صبر، عزیمت وغیرہ کی صفات پیدا ہونے کا کوئی ذرہ بھر امکان بھی ہوتا ہے؟ عمر عزیز کا اس قدر طویل حصہ صرف کرنے کے بعد بھی اس متاعِ عظیم میں سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ پھر کیسے مان لیا جائے کہ سائنسی علم بھی اسی منزل کی طرف لے جاتا ہے جہاں اسلام لے جانا چاہتا ہے؟ اگر کسی شخص نے ابھی تک جہنم کا نام جنت نہیں رکھا ہے تو اسے اس سوال کا جواب دینا ہی ہوگا۔ سائنسی علمیت کے حامل ہر معاشرے میں مادیت پرستی[1] کے ظہور کو محض حادثہ سمجھنا بذاتِ خود ایک حادثہ ہے نہ کہ کوئی علمی استدلال۔

حامیانِ سائنس مسلم مفکرین کے نزدیک سائنس کو سرمایہ دارانہ علم کہنا ایک غیر علمی دعویٰ ہے۔ سرمایہ دارانہ علمیت ہونا نہ صرف ممکن ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ علمیت ہونا امر لازم ہے۔ اگر سرمایہ داری ایک نظام زندگی ہے، تو پھر اس کی کوئی نہ کوئی علمیت ضرور ہونی چاہیے کیونکہ بغیر نظام زندگی کا تصور ہی محال ہے۔ ہر نظام کے پاس انسانی زندگی کو فرد، معاشرے اور ریاست کی سطح پر ترتیب دینے کا اپنا اصول ہوتا ہے۔ اس اصل الاصول کو علمی جامہ پہنانے کے لیے فیصلے کرنا اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے جب ایک علمیت موجود ہو۔ مثلاً اسلامی نظام زندگی تبھی ممکن ہے جب فقہ اور اصولِ فقہ نامی کوئی علم موجود ہو جو یہ بتائے کہ ان گنت انسانی اعمال سے شارع کی رضا حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ بالکل اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام انسانی زندگی کو

[1] مادیت پرستی نئے انسان یعنی ہیومن بی انگ کا مذہب ہے جس کے نتیجے میں ایک نیا کلچر قائم ہو گیا ہے۔ اس فکر کا مطلب یہ ہے کہ لامحدود خواہشات کی تکمیل کے لیے مر کر جنت پہنچنے کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ جدید سائنس وٹیکنالوجی کے ذریعے اسی دنیا میں جنت کا حصول ممکن ہے۔ مگر ماضیٔ قریب کی تحقیقات نے بتادیا ہے کہ اس کائنات میں ''ضابطۂ ناکارگی'' (Entropy) کا عمل در آمد ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ یہاں حصول جنت ممکن نہیں کیونکہ کائنات مسلسل خاتمے کی طرف رواں دواں ہے۔

آزادی یعنی سرمایے میں لامحدود اضافے کے اصل الاصول پر مرتب کرتی ہے اور وہ علم جو انسانی حیات کی اس تشکیل و تربیت کو ممکن بناتی ہے اسے سائنس کہتے ہیں۔ بالفرض یہ بات ٹھیک ہے کہ سائنس سرمایہ دارانہ علمیت نہیں تو پھر اس کی علمیت کیا ہے؟ اور اگر اس کی کوئی علمیت ہی نہیں تو پھر سرمایہ داری نظام زندگی کس طرح ہے؟ یہاں یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ بہت سے سائنس دان سرمایہ دارانہ افکار کے غلبے سے پہلے سائنسی تحقیقات کی داغ بیل ڈال چکے تھے مثلاً نیوٹن اور بیکن وغیرہ جس سے ثابت ہوا کہ سائنس سرمایہ داری کے بغیر بھی ممکن ہے۔ مگر بنیادی اور قابل غور سوال یہ ہے کہ کیا سرمایہ داری کے غلبے کے بغیر نیوٹن کو وہ تاریخی حیثیت و مقام ملنا ممکن تھا جو اسے اب حاصل ہے؟ کیا سرمایہ دارانہ ترقی کے بغیر سائنسی علمیت کے غلبے کا کوئی امکان موجود ہے؟

یہ فرض کرنا کہ اسلام اور سائنس علم کے دو ایسے علیحدہ دائرے ہیں جن کی وجہ سے انسانی زندگی میں کوئی مغایرت پیدا نہیں ہوتی درحقیقت علمیت اور انسانی زندگی کی کلیت کا ادراک نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ سائنس اور اسلام رویے نہیں بلکہ علم ہیں اور علم پوری انسانی زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی معاشرے میں دو مختلف الانواع علمیات بیک وقت کارفرما ہوں۔ جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو افراد لازماً منافقانہ طرزِ زندگی گزارنے پر مجبور ہوجاتے ہیں جیسا کہ مسلم ممالک جو نہ تو پوری طرح اسلام کے ہو رہتے ہیں اور نہ ہی مکمل طور پر مغرب کو اپنا پاتے ہیں۔ اولاً تو حامیانِ سائنس مسلم مفکرین کا اسلامی اقدار کی حامل سائنس کے امکان کا دعویٰ ہی محل نظر ہے، اگر اس امکان کو مان بھی لیا جائے تب بھی سوال یہ ہے کہ ایسی سائنس ہے کہاں؟ جب غیر سرمایہ دارانہ سائنس بنالی جائے گی تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے مفکرین نے موجودہ سائنس ہی کو اسلامی ثابت کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ ممکن ہے سائنس اور سرمایہ داری کا گٹھ جوڑ ایک تاریخی حادثہ ہو جیسا کہ فیئرابینڈ وغیرہ کا بھی خیال ہے۔ یعنی ممکن ہے واقعی یورپ میں مذہب بےزاری، سرمایہ دارانہ افکار کا فروغ، سیاسی انقلاب، سائنسی تحقیقات کا عروج، صنعتی انقلاب وغیرہ کسی حادثے کے تحت یکے بعد دیگرے رونما ہوئے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دورِ حاضر میں جو شے عملاً غالب ہے وہ سرمایہ دارانہ سائنس کے سوا کچھ نہیں۔ مسلم مفکرین کے دلیلیں نہ دینے سے سائنس کی ترقی پر کوئی فرق نہیں پڑے گا اور نہ ہی سائنس اپنے غلبے کے لیے اسلامی دلیلوں کی محتاج ہے۔ ان حالات میں کسی فرضی سائنس کے امکان کو بنیاد بنا کر سائنس

کی جو بھی مذہبی توجیہ پیش کی جائے گی[۱] وہ موجودہ غالب سائنس ہی کی تائید وتصویب کا باعث بنے گی۔ اسلامی سائنس کے نام پر جو بھی نقشہ تیار ہوگا وہ ویسا ہی ہوگا جیسا ''اسلامی معاشیات وبینک کاری'' اور ''اسلامی جمہوریت'' کا ہے جس میں تمام سرمایہ دارانہ اقدار کو اسلام کا لبادہ اوڑھا کر ان پر ''اسلامی'' کا لیبل چسپاں کر دیا گیا ہے۔ تاریخ واضح طور پر یہ سبق دے رہی ہے کہ سائنس ہر جگہ سرمایہ داری کے غلبے اور مذہب کے زوال کا باعث بنی مگر حامیانِ سائنس مسلم مفکرین پھر بھی اسی کے حق میں تاویلیں تراش رہے ہیں۔ ان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ سائنس کے ساتھ اسلامی رویہ حکمت عملی کی بجائے آئیڈیل بنیادوں پر استوار کرنے پر مصر ہیں (جاری ہے)۔

---

[۱] ایسی مذہبی توجیہات میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔ اسلام بھی تسخیر کائنات پر زور دیتا ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی زمین وآسمان میں جو کچھ ہے ہم نے انسان کے لیے اسے مسخر کر دیا ہے، کا حوالہ موجود ہے اور قرآن مجید بار ہا کائنات اور آفاق وانفس کی نشانیوں پر غور وفکر کی پر زور دعوت دیتا ہے۔ یہ دلیل اس حقیقت سے سہو نظر کر رہی ہے کہ غور وفکر کسی مجرد عمل کا نام نہیں بلکہ یہ ایک خاص مقصد کا متقاضی ہے اور اس عمل کی نوعیت، مقدار اور حدود اس مقصد ہی سے طے پاتی ہیں جس کی خاطر غور وفکر کیا جا رہا ہے۔ اس دلیل کی صحت اس مفروضے پر مبنی ہے کہ قرآن کی دعوتِ تفکر فی الارض کا مطلب اور مقصد انسان کو تسخیر کائنات اور دنیا سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہونے کی طرف رغبت دلانا ہے۔ ظاہر ہے قرآنی اصطلاح ''تفکر فی الارض'' کا مطلب ''تصرف فی الارض'' نہ تو متقدمین مفسرین کرام میں سے کسی نے بیان کیا ہے اور نہ ہی قرآنی آیات اور ان کے مضامین اس تفسیر کی اجازت دیتے ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ قرآن جنہیں منعمین کا گروہ کہہ کر ان کی پیروی کا حکم دیتا ہے ان کی زندگیوں کا کتنا حصہ ''تصرف فی الارض'' پر غور وفکر میں صرف ہوا؟

۲۔ یہ کائنات صفاتِ الٰہیہ مثلاً خلق، علم، قدرت، حکمت وغیرہ کا مظہر ہے لہٰذا اگر کوئی مسلمان اس کا مطالعہ ان صفات کی تفہیم وتبیین کے لیے کرتا ہے تو یہ نہایت قابل تحسین رویہ ہے۔ اگر اس دلیل کا مقصد کسی دہریے کے ساتھ مجادلہ کرنے کے لیے سائنسی تحقیقات کو بطور الزامی حجت استعمال کرنا ہے تو شاید اس کے جواز کی کوئی صورت نکل آئے، لیکن یہ سائنسی جستجو کے فروغ کی کوئی اصولی دلیل نہیں کیونکہ اصولاً صفاتِ الٰہیہ کا ادراک تجرباتِ انسانی کی روشنی میں ہونا ممکن نہیں۔ اس کا طریقہ صرف اور صرف انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات پر ایمان لا کر ان پر عمل کرنا ہے۔ کسی شے کا ایک اضافی فائدہ ہرگز اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہوتا۔ ایسے چند فوائد تو جادو وغیرہ میں بھی دکھائے جا سکتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان جادو سیکھنے اور سکھانے کو بطور قدر اور اصول اپنا لیں۔

تعلیم و تربیت عبداللہ میر

دینی مدارس کے وفاقوں کے تنظیمی مسائل

* مولانا فضل الرحمن کی وفاق المدارس العربیہ کا صدر بننے کی کوشش
* پروفیسر ساجد میر صاحب وفاق المدارس السّلفیہ کے پہلے ہی صدر بن چکے ہیں
* تنظیم المدارس میں دھڑے بندی اور صدارت پر جھگڑا

جس طرح کسی تعلیمی ادارے کے تنظیمی مسائل ادارے کی تعلیمی سرگرمیوں اور ان کی کوالٹی پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی طرح دینی مدارس کے وفاقوں کا حال ہے جو ایک طرح سے دینی مدارس کے امتحانی بورڈ ہیں اور دینی مدارس کے طلبہ کو ڈگریاں جاری کرتے ہیں۔ حال ہی میں میڈیا میں یہ بحث سامنے آئی ہے کہ جمعیت علماء اسلام (ف) کے سربراہ مولانا فضل الرحمن کی یہ خواہش و کوشش ہے کہ وہ دینی مدارس کے سب سے بڑے (دیوبندی مکتب فکر کے) وفاق کے سربراہ بن جائیں۔ اس موضوع پر کئی اصحاب نے اظہار خیال کیا ہے جن میں مدیر البرہان ڈاکٹر محمد امین، ملی یکجہتی کونسل کے اکبر ثاقب، خورشید ندیم (جاوید غامدی صاحب کے تلمیذ)، مولانا اسرار مدنی، شہر یار عباسی، ضیاء الرحمن اور دیگر شامل ہیں۔ ہم ان اصحاب کی پیش کردہ آراء کا ذکر کریں گے اور آخر میں اپنی کچھ گزارشات بھی پیش کریں گے۔

ڈاکٹر محمد امین نے دینی مدارس کو دو اصولی مشورے دیے ہیں: ایک تو یہ کہ وہ وفاقوں کے عہدیداروں کی مدت تقرری مختصر رکھیں اور دوسرے سیاسی زعماء کو اپنا سربراہ نہ بنائیں۔ انہوں نے اپنی فیس بک وال پر ''وفاق المدرس العربیہ میں اختلافات اور ان کا حل'' کے زیر عنوان لکھا ہے کہ:

''وفاق المدارس العربیہ کے انتخابات کے ضمن میں میڈیا میں آنے والے اختلافات کی خبروں کے حوالے سے راقم دینی مدارس کا خیر خواہ ہونے اور ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو پچھلے تیس سال سے مدارس کے معاملات میں غور و خوض کرتا اور دلچسپی لیتا آ رہا ہے، درخواست ہے کہ سارے وفاقوں کے ذمہ داران مندرجہ ذیل تجویز پر غور فرمائیں:

سارے وفاق اپنے دستور میں مندرجہ ذیل دو شقوں کا اضافہ کریں:

۱۔ کوئی عہدیدار مسلسل دو میقات سے زیادہ اپنے عہدے پر نہیں رہے گا۔

۲۔ کسی دینی سیاسی جماعت کے سربراہ کو وفاق کا سربراہ نہیں بنایا جائے گا۔

اس سے ان شاء اللہ دینی مدارس کے وفاقوں کو تازہ خون، نئے خیالات اور مفید تجربات کی حامل شخصیات قیادت کے لیے ملتی رہیں گی۔ نیز مدارس چونکہ علم و تعلیم اور تدریس و تحقیق کے مراکز ہوتے ہیں اس لیے ان کی قیادت کے لیے مدارس کا کوئی تجربہ کار معلم، محقق اور منتظم ہی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔"

خورشد ندیم صاحب نے روز نامہ 'دنیا' میں اپنے کالم ''تکبیر مسلسل'' میں مولانا فضل الرحمن کے صدر بننے کو دینی مدارس کے لیے نقصان دہ قرار دیتے ہوئے انہیں تحریک دیو بند کی تقسیم کار کی پالیسی کے خلاف قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''مولانا فضل الرحمن وفاق المدارس کی صدارت کے لیے امیدوار ہیں۔ اُن کا یہ فیصلہ دیو بندی مدارس کے لیے کتنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا'' ہے میرا خیال ہے خود مولانا کو بھی اس کا اندازہ نہیں ہے۔

وفاق المدارس دیو بندی مدارس کا انتظامی بورڈ ہے جو نصاب، داخلہ، امتحان اور سند جیسے معاملات کا ذمہ دار ہے۔ پھر ہر مسلک کا اپنا مدرسہ بورڈ ہے۔ جماعت اسلامی نے جو مدارس قائم کیے، ان کا الگ بورڈ ہے۔ ان کی اسناد کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

اب ہر مسلک کے لوگوں نے اپنی سیاسی جماعتیں بھی بنا رکھی ہیں، تاہم اس بات کی شعوری کوشش کی جاتی ہے کہ مدارس کو سیاست سے الگ رکھا جائے۔ اس میں ایک حکمت ہے۔ الگ تنظیمی وجود کی وجہ سے مدارس سیاست کے اثرات سے محفوظ رہتے ہیں۔ یوں معاشرہ اور ریاست دونوں مدارس کو ان کی انفرادی حیثیت میں دیکھتے اور ان کے لیے اپنا دست تعاون دراز کیے رکھتے ہیں۔

مولانا اگر وفاق المدارس کے صدر بنتے ہیں تو دیو بندی مدارس کو سیاسی کشمکش سے الگ رکھنا ممکن نہ ہوگا۔ یوں اندیشہ ہے کہ یہ مدارس ریاست اور معاشرہ دونوں کی نظر میں متنازع ہو جائیں گے اور اس تائید سے بڑی حد تک محروم ہو جائیں گے جو انہیں اس وقت میسر ہے۔ مَیں مولانا کے اس فیصلے کا کوئی فائدہ تلاش نہیں کر سکا جو مدارس کو پہنچ سکتا ہو۔

دارالعلوم دیو بند، برصغیر میں ہماری روایت کے دفاع کا ایک اہم مورچہ رہا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ، یہ تعلیمی ادارہ ایک ہمہ جہت تبدیلی کی تحریک بن گیا۔ علی گڑھ بھی تعلیمی ادارے سے بیداری کی ایک دوسری تحریک بنا جو اسی طرح ہمہ گیر تھی۔ دیو بند کی اسی ہمہ گیریت نے اسے ہماری تاریخ کی سب سے مؤثر تحریک بنا دیا۔ اس کی کامیابی کا راز تقسیمِ کار کا اصول ہے جو اس کے بانیوں نے ابتدا ہی میں اختیار کیا۔

تحریک دیوبند نے مسلم سماج کو تین حوالوں سے اپنا مخاطب بنایا: تعلیم، دعوت وتزکیہ اور سیاست۔ تعلیم سے ان کی مراد درس وتدریس کی اس روایت کا احیا تھا جو انگریزوں کی آمد سے پہلے موجود تھی اور جسے انگریزی عہد میں متروک قرار دے دیا گیا۔ اس تعلیمی روایت میں دین بھی تھا اور دنیا بھی۔ جب دنیاوی معاملات کو انگریزوں نے نئی نہج پر استوار کیا تو مدرسہ کی تعلیم کا وہ حصہ غیر متعلق ہو گیا جو دنیاوی امور سے متعلق تھا۔ اب اس کی افادیت صرف دینی وتہذیبی حوالے سے باقی تھی اور یہ بھی کچھ کم اہم نہیں تھا۔ دارالعلوم دیوبند کی حیثیت مادرِ علمی کی تھی۔ اس کے بچے مدارس کی صورت میں سارے برصغیر میں پھیل گئے۔ یہاں افغانستان سے لے کر آسام تک، ہر جگہ سے لوگ پڑھنے آتے تھے۔ فارغ التحصیل ہو کر یہ علماء اپنے آبائی علاقوں کو لوٹتے اور مقامی آبادی کے تعاون سے مدرسہ قائم کر لیتے۔ یوں یہ تعلیمی سلسلہ پورے خطے میں پھیل گیا۔ یہ علماء دین کے اسی فہم کو عام کرتے جو انہوں نے دارالعلوم سے حاصل کیا۔ اس طرح تفہیم دین کا ایک ہی اسلوب چاروں اطراف پھیل گیا جس نے ایک فکری ہم آہنگی کو جنم دیا۔ یہاں سے فارغ ہونے والے علماء میں ایسے بھی تھے جو صوفیانہ مزاج رکھتے تھے۔ انہوں نے مختلف علاقوں میں خانقاہوں کو آباد کر لیا۔ یہ برصغیر کے تصوف کی روایت کے امین ٹھہرے جو دیوبندیوں اور بریلویوں میں یکساں جاری ہے۔

اس تحریک کا دوسرا محاذ دعوت تھا۔ اس کے لیے تبلیغی جماعت قائم ہوئی۔ ابتداء میں یہ میوات اور چند ملحقہ قصبات تک محدود تھی لیکن بعد میں اسے وسعت دے دی گئی۔ یہ پورے برصغیر میں پھیل گئی۔ اس تحریک کے بانی بھی دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ انہوں نے اس تحریک کو دین کی بنیادی باتوں کی دعوت تک محدود رکھا۔ تیسرا محاذ سیاسی تھا۔ اس کے لیے جمعیت علمائے ہند قائم ہوئی۔ جمعیت علمائے ہند کے سامنے ایک بڑا مقصد، اس خطے کو انگریزوں کی غلامی سے نجات تھا۔ اس لیے اس جماعت کو مسلمانوں کا وسیع البنیاد محاذ بنایا گیا۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ یہ مسلک دیوبند سے تعلق رکھنے والوں کی سیاسی جماعت بن گئی۔

تعلیم، تزکیہ، دعوت اور سیاست کے محاذوں پر بیک وقت کام کرنے سے مسلک دیوبند برصغیر کی سب سے بڑی تحریک بن گیا۔ آج اس خطے میں کوئی دوسری ایسی فکری ومذہبی تحریک نہیں جو اپنے اثرات کے اعتبار سے ایسی ہمہ گیر ہو۔ یہ روایت تقسیم ہند کے بعد بھی قائم رہی۔ دیوبند مدارس کی خانقاہیں اسی طرح آباد رہیں۔ تبلیغی قافلے بھی اسی طرز پر رواں دواں رہے۔ جمعیت علمائے ہند کی جگہ جمعیت علمائے اسلام نے لے لی۔ اس کامیابی کا راز تقسیمِ کار کا اصول ہے۔ سیاست، دعوت اور تعلیم وتزکیہ کے مطالبات ایک دوسرے سے مختلف اور بعض اوقات متصادم

ہوتے ہیں۔ان کی الگ الگ تنظیم کا فائدہ یہ ہے کہ سب کاموں کی حکمت عملی ان کی رعایت سے اپنائی جاسکتی ہے اور ایک کام دوسرے کو متاثر نہیں کرتا۔مثال کے طور پر دین کی تعلیم ایک معاشرتی ضرورت ہے۔ایک شہری جو اس کے بارے میں حساس ہے، وہ مدرسے کو باقی رکھنے کے لیے اس کو وسائل فراہم کرتا ہے۔یہ شہری سیاسی اعتبار سے مسلم لیگی ہوسکتا ہے، پی ٹی آئی سے وابستہ ہوسکتا ہے یا کسی اور جماعت سے۔وہ اپنی سیاسی وابستگی سے بے نیاز ہو کر مدرسے کی مدد کرتا ہے۔جیسے ہی مدرسے کی باگ ایک سیاسی شخصیت کے ہاتھ میں دی جائے گی، اس شہری کا دست تعاون سمٹ جائے گا جو اس کے سیاسی مؤقف سے اختلاف رکھتا ہے۔اسی طرح ایک داعی ہے جس کا مخاطب تمام معاشرہ ہے اور وہ سب کو دین کی طرف بلا رہا ہوتا ہے، اس کا احترام سیاسی وابستگی سے ماوراہے۔جیسے ہی وہ اپنا وزن ایک سیاسی جماعت کے پلڑے میں ڈالتا ہے، اس کی شخصیت متنازعہ ہونے لگتی ہے جس کا نقصان اس کی دعوت کو پہنچتا ہے۔اس کی مثال مولانا طارق جمیل ہیں۔انہوں نے عمران خان کی حمایت میں متحرک ہو کر، خود کو اور دعوت کو بہت نقصان پہنچایا۔شوکت خانم ہسپتال بھی اسی طرح کی ایک مثال ہے۔لوگ سیاسی وابستگیوں سے بے نیاز ہو کر اس کے لیے تعاون کرتے تھے جیسے ہی عمران خان سیاست میں آئے، اس کی پہلی زد اس ہسپتال پر پڑی۔اب ایک مسلم لیگی اس ادارے کی مدد کس دل سے کرے گا جس کے لیڈر کو خان صاحب صبح شام صلواتیں سناتے ہیں؟

یہ مثالیں بتاتی ہیں کہ تقسیم کار کے اصول میں کیا حکمت ہے۔مولانا وفاق المدارس کا صدر بن کر اس اصول سے انحراف کریں گے۔وہ ایک سیاست دان ہیں اور ہر سیاست دان کی طرح متنازع۔جس دن وفاق المدارس کے صدر بنیں گے، وفاق المدارس بھی متنازع ہو جائے گا۔اب تحریک انصاف کا ایک کارکن، مدرسے کو ضروری سمجھنے کے باوجود، اس مدرسے کو کیوں چندہ دے گا جس کا سربراہ صبح وشام اس کی جماعت کی حکومت کو ختم کرنے کے لیے سرگرداں ہے؟

وفاق المدارس کا مفاد تقاضا کرتا ہے کہ اس کی سربراہی مولانا تقی عثمانی یا مولانا زاہد الراشدی جیسی کسی شخصیت کے پاس ہو۔مولانا ایک سیاسی رہنما ہیں۔ان سے اختلاف رکھنے والے بہت سے دیوبندی وفاق سے وابستہ ہیں کیونکہ وفاق کا مولانا کی سیاست سے براہ راست کوئی تعلق نہیں جیسے دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک۔قاری حنیف جالندھری صاحب ایک متحرک شخصیت ہیں اور بطور ناظم اعلیٰ وفاق کے مفادات کا بخوبی تحفظ کررہے ہیں۔ان کے ساتھ ایک عالم دین کی صدارت وفاق کے لیے زیادہ موزوں ہے۔اگر مولانا نے اپنے فیصلے پر اصرار کیا تو میرا احساس ہے کہ ان کا یہ فیصلہ وفاق المدارس میں تقسیم کی بنیاد رکھ دے گا۔''

'اسلام ٹائمز' میں اکبر ثاقب صاحب کی رائے بھی یہی ہے کہ مولانا کے وفاق المدارس کا صدر بننے کے مدارس پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ وفاق المدارس العربیہ میں پھوٹ پڑ سکتی ہے اور اس کے دیگر وفاقوں سے تعلقات خراب ہو سکتے ہیں۔ضیاء الرحمن صاحب نے وائس آف امریکہ کی ایک رپورٹ کا اس موضوع پر ذکر کیا ہے۔ مولانا اسرار مدنی نے مولانا فضل الرحمن کے صدر بننے کے فوائد ونقصانات دونوں کا ذکر کیا ہے۔

آخر میں ہم مدیر البرہان کے مذکورہ دو اصولوں کی تائید کرتے ہوئے چاہیں گے کہ ان اصولوں کا اطلاق دوسرے وفاقوں پر بھی ہونا چاہیے اور عہدیداروں کی کم مدت کا اطلاق وفاقوں کے ناظم اعلیٰ پر بھی ہونا چاہیے کیونکہ وہ بھی وفاقوں کے چلانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔اس سلسلے میں ہماری گزارشات درج ذیل ہیں:

وفاق المدارس العربیہ میں ناظم اعلیٰ کا تنازعہ

ہمارے علم کی حد تک وفاق المدارس العربیہ میں نہ صرف صدارت کا جھگڑا ہے بلکہ اس کے سیکرٹری جنرل/ ناظم اعلیٰ کے عہدے کا تنازعہ بھی ہے۔ وفاق کے پچھلے انتخابات کے موقع پر بھی کچھ لوگوں نے مولانا محمد حنیف جالندھری صاحب کی جگہ کوئی دوسرا ناظم اعلیٰ لانے کی کوشش کی تھی لیکن پھر بات دبا دی گئی۔بعض لوگوں کی رائے میں مولانا جالندھری حکومتوں اور ایجنسیوں کے فیورٹ ہیں اور طویل عرصے سے اس عہدے پر متمکن ہیں اور وفاقوں میں ایسا ماحول پیدا کر دیا گیا ہے کہ جو ایک دفعہ صدر یا ناظم اعلیٰ بن جاتا ہے ہمیشہ کے لیے صدر یا ناظم اعلیٰ بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر صاحب کو مولانا سلیم اللہ خان صاحب کے انتقال کے بعد صدر بنایا گیا تھا جبکہ مولانا سلیم اللہ خان بھی ۲۷ سال تک صدر رہے اور ان کو بدلا نہ جاسکا۔ اب مولانا فضل الرحمن صاحب وفاق کا صدر بننا چاہتے ہیں اور وفاق میں ان کی لابی خاصی مضبوط ہے لیکن ان کے مخالفین کی بھی کمی نہیں جنھوں نے ان کے صدر بننے کی مخالفت کی ہے۔ یاد رہے کہ مولانا فضل الرحمن کا سیاسی کردار ملک میں خاصا متنازعہ ہے اور اکثر لوگ ان کی سیاست کو اقتدار اور مفادات کی سیاست سمجھتے ہیں۔لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک میں دین کا مطلب چونکہ مسلک ہوتا ہے لہٰذا مولانا فضل الرحمن مدارس کو یقین دلاتے رہتے ہیں کہ وہ دیوبند کے نمائندہ ہیں اور دیوبندی مدارس بھی خواہی نخواہی دیوبندی ہونے کی وجہ سے ان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں حالانکہ حق کا ساتھ دینا چاہیے نہ کہ اپنی مسلکی عصبیت کا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حق کے علاوہ

کسی دوسری عصبیت کی حمایت کی شدید مذمت فرمائی ہے۔

وفاق المدارس السّلفیہ

سیاسی لوگوں کے مفادات ان کو مدارس کے وفاقوں پر قبضے پر اکساتے رہتے ہیں چنانچہ یہی کچھ وفاق المدارس السّلفیہ میں ہوا اور پروفیسر ساجد میر صاحب نے جو ایک ٹیکنیکل کالج میں انگریزی کے لیکچرر تھے اور اب عرصہ دراز سے مرکزی جمعیت اہل حدیث کے صدر ہیں، وہ اہلحدیث مدارس کے وفاق کے صدر بن گئے۔ یاد رہے کہ اہل حدیث بھائیوں میں بدقسمتی سے بہت افتراق ہے اور ان کی بے شمار جمعیتیں اور جماعتیں ہیں لیکن ایک بڑی سیاسی جمعیت کا صدر ہونے کے ناطے پروفیسر ساجد میر صاحب نے وفاق کا صدر بننا بھی ضروری سمجھا اور باقی لوگ طوعاًو کرھاًانہیں قبول کرنے پر مجبور ہیں۔

تنظیم المدارس

تنظیم المدارس میں بھی دھڑے بندی عروج پر ہے۔ اور جھگڑا عدالت میں لے جایا جاچکا ہے۔ مخالفین کا خیال تھا کہ حکومتی ایجنسیاں مولانا مفتی منیب الرحمن کو صدر بنانے میں دلچسپی رکھتی ہیں جو طویل عرصے سے رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین تھے اور حکومتوں سے فعال رابطے رکھتے تھے۔ چنانچہ پنجاب کے اکثر دینی مدارس نے تنظیم کے انتخابات اور مفتی صاحب کی صدارت کو چیلنج کر دیا اور تنازعہ جاری ہے۔

حل کیا ہے؟

ہماری رائے میں اس صورتِ حال کا ایک ہی حل ہے جو حال ہی میں مدیر البرہان نے پیش کیا ہے کہ دینی مدارس کے سمجھ دار لوگ اور اہل حل وعقد دو باتوں کو اپنے وفاقوں میں قانونی شکل دے لیں: ایک یہ کہ کوئی شخص دو سے زیادہ مدت کے لیے کسی عہدے پر متمکن نہ رہے تاکہ وفاق تازہ خون، نئے خیالات اور مفید تجربات سے محروم نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ کسی سیاسی جماعت کا سربراہ وفاق کا صدر نہ بن سکے۔ کیونکہ سیاسی لوگ سیاسی مفادات کے تحت فیصلے کرتے ہیں جبکہ مدارس علم وتعلیم اور تدریس وتحقیق کے مراکز ہوتے ہیں اور ان کے لیے مدارس کا کوئی تجربہ کار معلم، محقق اور منتظم ہی زیادہ مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

ہم دینی مدارس کے علماء کرام سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہماری ان گزارشات اور تجاویز پر سنجیدگی سے غور فرمائیں اور اگر انہیں مناسب سمجھیں تو ان پر عمل کریں۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العلمین.

وفاقی وزارت تعلیم کا دینی مدارس کے نئے وفاق بنانے کا فیصلہ

قواعد وضوابط سمیت شرائط پر مشتمل دستاویزات مدارس کو بھجوادی گئیں

معلوم ہوا ہے کہ مدارس کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر وفاقی وزارتِ تعلیم نے دینی مدارس کے لیے مزید امتحانی بورڈ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کے لیے شرائط وضوابط مدارس کو بھجوادی گئی ہیں۔ نئے امتحانی بورڈ کے لیے کم ازکم پانچ مفتیان کرام، شیخ الحدیث اور مدرسہ مہتمم جن کا کم ازکم تجربہ دس سال ہو، وزارتِ تعلیم کو درخواست دیں گے۔ کم ازکم دس فیصد مدارس کی لسٹ درخواست کے ساتھ منسلک ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ درخواست کے ساتھ ادارے کے اغراض ومقاصد، دستور، نصاب، بینک اکاؤنٹس کی تفصیلات، منسلک جامعہ اور جامعات کی تفصیل سمیت مرکزی ایگزیکٹو کمیٹی اور شوریٰ کے ارکان کے نام دینا لازم ہوگا۔ وفاق سے منسلک تمام مدارس اور جامعات کی رجسٹریشن بحیثیت ایک تعلیمی ادارہ لازمی ہوگی۔ دینی مدارس و جامعات اپنے نصاب تعلیم، نظام تعلیم، مالی امور، نظام امتحانات اور تنظیمی وداخلی امور میں مکمل طور پر آزاد اور خودمختار ہوں گے۔ (نوائے وقت ۲۲ جنوری ۲۰۲۱ء)

پاکستان میں دینی مدارس کی تعلیم

نام وفاق	تعداد مدارس	تعداد طلبہ
وفاق المدارس العربیہ	۲۱،۵۶۵	۲۸،۰۰،۰۰۰
تنظیم المدارس اہلسنت	۹،۶۱۶	۱۳،۰۰،۰۰۰
وفاق المدارس السّلفیہ	۱،۴۰۰	۴۰،۰۰۰
رابطۃ المدارس الاسلامیہ	۱،۳۰۰	۳۰،۰۰۰
وفاق المدارس الشیعہ	۵۵۰	۱۹،۰۰۰
کل تعداد	۳۴،۴۳۱	۴۱،۸۹،۰۰۰

ماخذ: وائس آف امریکہ (رپورٹ ضیاء الرحمن مؤرخہ ۱۴ جنوری ۲۰۲۱ء)

تفہیم مغرب ڈاکٹر محمد رضوان

کرسپر ٹیکنالوجی
تعارف، اثرات اور اسلامی نقطہ نظر

یوں تو ہر سال نوبیل انعام کا اعلان کیا جاتا ہے اور سائنس دان حضرات اور ان کی محدود دنیا میں اس پر مختلف طرح کے ردعمل سامنے آتے ہیں۔ یہاں یہ نہ بھولیں کہ اس محدود دنیا کے انسانی سماج پر لامحدود اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ نوبیل انعام سویڈن کے ایک باشندے الفریڈ نوبیل کی وصیت کے مطابق اُس سائنس دان کو دیا جاتا ہے جو پچھلے ایک سال کے دوران سائنس کی دنیا کے پانچ میدانوں میں سے کسی ایک میں ایسا کارنامہ سرانجام دے جو انسانیت کے لیے زبردست فائدے کا حامل ہو۔

نوبیل انعام سائنس کی دنیا کا موقر ترین انعام ہے۔ عام طور پر یہ انعام تعصبات سے پاک ہوتا ہے (سوائے سیاسی میدان میں دیے جانے والے نوبیل انعام کے، جو بسا اوقات مضحکہ خیز حد تک جانب داری پر مبنی ہوتے ہیں)۔

گزشتہ سال (۲۰۲۰ء) علم کیمیا کے میدان میں دو خواتین سائنس دانوں کو نوبیل انعام سے نوازا گیا جو ایمانوئل کارپنٹیئر اور جنیفر اے ڈوڈنا ہیں۔ یہ انعام انہیں کرسپر ٹیکنالوجی کی دریافت پر دیا گیا ہے۔

سائنسی حلقوں میں کرسپر چند سال قبل یعنی ۲۰۱۴، ۲۰۱۵ء کے دوران مقبول و معروف ہو چکا تھا اور اس کی یہ مقبولیت اور معروفیت اس کے دوررس نتائج کی وجہ سے تھی۔ ابتدا میں جن لوگوں نے اس ٹیکنالوجی کے استعمال کے منفی پہلوؤں پر روشنی ڈالی انہیں شکی مزاج کہا گیا۔ حالانکہ خود اس کی موجدہ نے دبے الفاظ میں اسے منضبط کرنے (regulate) پر زور دیا تھا۔

کرسپر ٹیکنالوجی کیا ہے؟

کرسپر (CRISPR) دراصل Clustered Regularly Interspaced Short Palindromic Repeats کا مخفف ہے۔ یہ مخفف دراصل وراثتی مادہ ڈی این اے میں موجود نائٹروجنی اساس کی ایک خاص ترتیب سے متعلق ہے۔

عام فہم زبان میں یہ ایک ایسی قینچی ہے جو ہمارے خلیے کے اندر موجود موروثی مادے کو ہماری حسبِ خواہش کاٹ سکتی ہے۔ اور یہ ''کاٹنا'' غیر معمولی صحت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر ہم آسانی کے لیے سمجھنا چاہیں تو ذیل میں دی گئی تخفیفی شکل سے، ہم اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ انسان بالآخر اپنے جینز اور ماحول کی پراڈکٹ ہے۔ اور کس طرح ان جینز کو تبدیل کر کے انسان سمیت ہر جان دار کو یکسر مختلف جان دار یا انسان میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

انسان انسانی اعضا نسیج اور بافت خلیات حیاتیاتی سالمات مرکزہ ڈی این اے

یعنی انسان کا مادی وجود (سائنسی نقطۂ نظر کی رو سے) اصل میں صرف ان 30 ہزار جینز اور ان کے مختلف ریگولیشن اور ماحول کے بعض عوامل کا مجموعہ ہے یا دوسرے لفظوں میں 30 ہزار الفاظ کی کہانی ہے جو صرف ۴ حروف تہجی (A,G,T,C) سے لکھی گئی ہے۔

یہ حقیقت کہ چار حروف سے لکھی گئی یہ 30 ہزار صفحات پر مشتمل کہانی ہر بار الگ ہوتی ہے، اور نہ جانے کتنے عرصے سے چلی آ رہی ہے۔۔۔ یہ خالق پر ایمان لانے کے لیے کافی ہے۔

ہر جان دار (انسان) اس کتاب کا ایک جز اپنی ماں سے اور ایک جز اپنے باپ سے حاصل کرتا ہے۔ اس کتاب میں سب کچھ لکھا ہے۔ ہمارے جسمانی اعضا کی بناوٹ (جیسے رنگ، آنکھ، ناک، کان، ہونٹ، ٹھوڑی) سے لے کر ہماری ذہانت کی سطح (آئی کیو)، ہمارے بعض رویے، یہاں تک کہ ہماری بعض ترجیحات بھی!

کرسپر ٹیکنالوجی اس کتاب کے کسی بھی ورق کو انتہائی صفائی سے کاٹ کر آپ کے من پسند ورق کو اس جگہ چپکا سکتی ہے۔ (ملحوظ رہے کہ اس کتاب کا بیشتر حصہ اُن اوراق پر مشتمل ہے جو اپنی مکمل کہانی رکھتے ہیں، اور اس کتاب کا کم حصہ ایسا ہے جو ایک دوسرے سے متصل ہے)۔

یعنی اس ٹیکنالوجی کا استعمال کر کے جان داروں کی ہیئت اور ان کے بہت سارے رویے تک منضبط کیے جا سکتے ہیں۔ یہ محض ہالی وڈ کی فکشن فلم یا مغرب کے فکشن ناول کا خیالی پلاؤ نہیں ہے بلکہ ایسا عین ممکن ہے۔ اور چوہے اور مینڈک میں ان کی جلد اور ان کی بعض خصوصیات کو اس ٹیکنالوجی کا استعمال کر کے بدلا جا چکا ہے۔

موروثی مادے (ڈی این اے) کی ایڈیٹنگ کی مختلف ٹیکنالوجیز جو گزشتہ صدی کی ستر کی دہائی سے آج تک ایجاد ہوئی ہیں، ان میں کرسپر ٹیکنالوجی سب سے تیز، سستی اور تیر بہدف

ٹیکنالوجی ہے۔ اس لحاظ سے اس ٹیکنالوجی کے استعمال کے مثبت اور منفی اثرات حیاتیاتی ٹیکنالوجی کی اخلاقیات پر زبردست سوالات کھڑے کردیتے ہیں۔ ذیل میں اس ٹیکنالوجی کے اثرات کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔ ملحوظ رہے کہ یہ ٹیکنالوجی دوسری ٹیکنالوجیز کی طرح محض مثبت و منفی اثرات نہیں رکھتی بلکہ اس ٹیکنالوجی کے بالطبع اثرات بالکل ایک نئی جہت کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس کی وضاحت آگے آئے گی۔

آگے جدول میں دیے گئے تمام نکات یا اثرات محض خیالی نہیں ہیں بلکہ ان سب نکات پر تفصیلی مقالات موجود ہیں، جن پر یہ تمام سائنسی کام کیے جا چکے ہیں۔ مثلاً زیبرافش میں اس ٹیکنالوجی کا استعمال کر کے مخصوص رنگ کے ذمہ دار جین کو درست کیا گیا۔ اسی طرح arabidopsis نامی پودے میں ایک خاص قسم کے جین میں تبدیلی کر کے اصولی طور پر ثابت کیا گیا کہ اس ٹیکنالوجی کے ذریعے چاول کی پیداوار کو بڑھایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ایک خاص قسم کے خنزیر میں اس ٹیکنالوجی کے ذریعے تبدیلی کر کے ایک جینیاتی مرض کے لیے تحقیقی ماڈل بنایا گیا۔ ایک جاپانی کالی گائے میں پائی جانے والی جینیاتی بیماری کو اس ٹیکنالوجی کا استعمال کر کے درست کیا گیا۔ سائنسی حلقوں میں اس تحقیقی مقالے کو بڑے جوش وخروش کے ساتھ لیا گیا، کیونکہ یہ براہِ راست اس بات کا ثبوت تھا کہ اگر گائے یا بیل میں یک جینی امراض کا علاج اس ٹیکنالوجی کا استعمال کر کے کیا جاسکتا ہے تو انسانی یک جینی امراض کا علاج بھی بہ آسانی کیا جاسکتا ہے۔

کرسپر ٹیکنالوجی پر شک کرنے والے یہ کہتے آئے ہیں کہ یک جینی تبدیلی یا ایڈیٹنگ تو آسان ہے لیکن ایک سے زائد جینز کی تبدیلی مشکل کام ہوگا۔ اور چونکہ فینوٹائپ یعنی ظاہری خصائص مثلاً رویّے، احساسات، رحم، مامتا، جلد کا رنگ، یا قد و قامت، یا آنکھوں کا رنگ ایسے خواص ہیں جو ایک سے زائد جینز کے ذریعے منضبط کیے جاتے ہیں۔ اس لیے اس ٹیکنالوجی کے اس پہلو سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں کہ یہ انسانوں یا جانوروں میں بہتری لانے کے لیے استعمال کی جائے گی بلکہ یہ بہت ہی مشکل بلکہ ناممکن کام ہے۔

ہمارے نزدیک یہ محض ایک تکنیکی دشواری ہے جس پر بہت ممکن ہے کہ جلد یا بدیر قابو پالیا جائے۔ اس کو اس مثال سے آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ابتدائی کمپیوٹر کا سائز ایک کمرے کے برابر ہوا کرتا تھا، اب وہ ہماری ہتھیلی میں سما سکتا ہے۔

صرف 25 سال پہلے تک ڈیٹا اسٹوریج ڈیوائس کی ڈیٹا محفوظ کرنے کی صلاحیت اور آج کی ڈیوائسز کی صلاحیت میں کوئی مقابلہ نہیں۔ پہلے ایک مکمل جانور کو قربان کر کے کچھ ملی لیٹر انسولین حاصل کی جاتی تھی۔ جینٹک انجینئرنگ کے ذریعے ای کولائی نامی بیکٹیریا سے سینکڑوں ملی لیٹر انسولین حاصل کی جاتی ہے۔ پہلے جان داروں بشمول انسان کے ڈی این اے میں موجود نائٹروجن اساس (ڈی این اے بیس) کی ترتیب (sequencing) کے لیے ہزاروں ڈالر خرچ کرنے پڑتے تھے۔ اب 100 ڈالر سے کم میں آپ خود اپنے ڈی این اے کی ترتیب معلوم کر سکتے ہیں۔ اور مستقبل قریب میں انسان کس طرح کی ذہنی اور جسمانی بیماری کا شکار ہوں گے ان کے امکانات کافی صد معلوم کر سکتے ہیں۔ یہ جینیاتی سطح کی مستقبل گوئی ہر گزرتے دن کے ساتھ بہتر سے بہتر ہوتی جا رہی ہے۔

اس لیے یہ بات شرح صدر کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ کرسپر کے سلسلے میں جن تکنیکی دشواریوں کا تذکرہ ماہرین کر رہے ہیں، ہمارے نزدیک وہ محض وقت کی بات ہے، اور صرف تین سال پہلے اس کا اصولی ثبوت محقق زوئے ای (Zue-e) وغیرہ نے دے دیا ہے۔ انھوں نے بندروں اور چوہوں میں سے کئی طرح کے جینز کو خارج (knock out) کر کے بتایا کہ مختلف جینز کے ذریعے کنٹرول ہونے والے افعال کو بھی اس تکنیک کے ذریعے تبدیل (manipulate) کیا جا سکتا ہے۔

اسی دوران کچھ دوسرے محققین نے انسانی جنین (embryo) میں دل کی بیماری پیدا کرنے والے خراب جین کی جگہ صحت مند جین کو کرسپر کے ذریعے تبدیل کر دیا۔ واضح رہے کہ دل کی یہ بیماری جین اور دیگر ماحولیاتی عوامل کے ذریعے ہوتی ہے۔ (اگرچہ کہ حیاتیاتی اخلاقیات کے اصولوں کی وجہ سے یہ جنین ضائع کر دیے گئے، لیکن اصولی طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ اس ٹیکنالوجی کے ذریعے جینز میں تبدیلی کی جا سکتی ہے)۔

چنانچہ یہ بات صاف ہو گئی کہ کرسپر ٹیکنالوجی میں بالطبع اس بات کی مکمل صلاحیت موجود ہے کہ سالماتی حیاتیات کی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ جان داروں میں ظاہری تبدیلی کو ممکن بنائے۔ بطور خاص جین اور ان کے افعال اور وہ تمام خاصے جو جین یا مختلف جینز کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں جیسے ظاہری خواص رنگ، قد و قامت اور بالوں اور آنکھوں کا رنگ۔۔۔ ان کے بارے میں جیسے جیسے سالماتی حیاتیات کی معلومات پختہ ہوتی جائیں گی، یعنی ہم یقین سے یہ کہہ سکیں گے کہ

فلاں اور فلاں جین ان ظاہری یا باطنی خواص کے لیے ذمہ دار ہیں ویسے ویسے ان جینز کی تبدیلی اس ٹیکنالوجی کے ذریعے ممکن ہوتی چلی جائے گی۔

ہمارے نزدیک یہ بات صرف یہیں تک نہیں رکے گی۔ باطنی خواص جیسے احساسات، رویے، رسپانس کی صلاحیت بالآخر سب کچھ جینز کے ذریعے ہی کنٹرول کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ابھی تک سالماتی حیاتیات اس طرح کے باطنی خواص یا خصوصیات کے سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ پا رہی ہے لیکن جانوروں میں بعض چونکانے والے تجربات ہوئے ہیں مثلاً ایسے مادہ چوہے جن میں آکسی ٹوسن نامی ہارمون پیدا کرنے والے جین کو نکال دیا گیا، انھوں نے اپنے بچوں سے کسی بھی قسم کی مامتا یا ان کی پرورش و پرداخت کے لیے درکار جد و جہد کا اظہار نہیں کیا۔ سائنس دان اسے مامتا کے ہارمون کا نام دیتے ہیں، یعنی جانوروں کی حد تک مامتا جیسا جذبہ محض ایک جین کی موجودگی اور غیر موجودگی پر منحصر ہے، یہ شک سے بالاتر ہو کر ثابت کیا جا چکا ہے۔ تو کیا انسانوں میں آکسی ٹوسن ہارمون ہی مامتا کی وجہ ہے؟

چونکہ انسانوں میں یہ تجربات اخلاقی حدود کی وجہ سے ممکن نہیں ہیں، اس لیے اس کا حتمی جواب ملنا مشکل ہے۔ لیکن تمام سائنس دان اس بات پر متفق ہیں کہ اگر یہ بات چوہے کے لیے درست ہے تو انسان کے لیے بھی تقریباً درست ہوگی۔

بالکل یہی صورتِ حال دیگر احساسات کے متعلق ہے۔ ان میں بعض داخلی احساسات جیسے درد کے جینز معلوم کر لیے گئے ہیں۔ ابتداءً یہ جانوروں میں معلوم کیے گئے۔ درد کے لیے ذمہ دار جینز انسانوں میں بھی دریافت ہو چکے ہیں۔ گو ان میں پیچیدگی پائی جاتی ہے لیکن بعید نہیں کہ سالماتی حیاتیات میں ہونے والی حیران کن ترقی ایک دن اس پیچیدگی کو بھی حل کر لے۔

حالانکہ اس طرح کے اندیشے نئے نہیں ہیں لیکن کرسپر کے غیر معمولی حد تک درست ہونے کی وجہ سے یہ اندیشے محض اندیشے نہیں رہے۔ ان میں مزید اضافہ اُس وقت ہو جاتا ہے جب ہم سالماتی حیاتیات (molecular biology) اور سالماتی جینیات (molecular genetics) کی حیران کن ایجادات کو دیکھتے ہیں۔

کرسپر ٹیکنالوجی کے ذریعے بہتری یعنی انسان کے داخلی یا ظاہری خواص کی تبدیلی کے اندیشے اُس وقت درست ثابت ہو گئے جب چین کے ایک سائنس داں نے ۲۰۱۸ء میں ایک

سائنسی کانفرنس میں دعویٰ کیا کہ اس نے دو انسانی جنین کو کرسپر تکنیک کے ذریعے ایڈز کے وائرس کے خلاف مزاحمت کے قابل بنا دیا ہے۔ اس نے انسانی خون میں پائے جانے والے سفید ذرات کی سطح پر موجود رسیپٹر (receptor) کے جین کو ''ساکت'' کر دیا، جس کی وجہ سے خون میں موجود ہونے کے باوجود یہ وائرس ان خلیات میں داخل نہیں ہو سکتا، اس کے نتیجے میں خون میں اپنی تعداد کو بڑھا نہیں سکتا اور بالآخر تباہ ہو جاتا ہے۔ یہ جنین بعد میں جڑواں لڑکیوں کی شکل میں پیدا ہوئے اور صحت مند ہیں۔ یہ اعلان سن کر امریکی اور یوروپی سائنس دانوں میں حسد و رشک کی لہر دوڑ گئی۔ حیاتیاتی اخلاقیات (bioethics) کے ماہرین ششدر رہ گئے اور پوری دنیا میں کرسپر ٹیکنالوجی پر مباحث تازہ ہو گئے۔ حالانکہ اس چینی سائنس دان نے اپنے نتائج کسی مقالے میں شائع نہیں کیے، تاہم بیشتر سائنس دانوں کا یہ ماننا ہے کہ ایسا عین ممکن ہے۔ بہر حال چینی حکومت کو جب اس کا پتا چلا تو اس سائنس دان کو جیل جانا پڑا۔

جینوم ایڈیٹنگ کی اخلاقیات کیا ہوں؟ کیا چینی سائنس داں انسانی جنین میں تبدیلی کے حوالے سے بایو ایتھکس کے متعلق نہیں جانتے تھے؟ یہ سوالات مزید سوالات کو جنم دیتے ہیں۔ عمومی طور پر کرسپر ٹیکنالوجی یا موروثی مادہ (ڈی این اے) کی ایڈیٹنگ یا اس میں تبدیلی کی اخلاقیات پر درج ذیل نکات ملتے ہیں:

* ٹیکنالوجی کے استعمال سے ہونے والے نقصانات کا مکمل فہم نہ ہونے کی وجہ سے انسانوں میں یا جانوروں میں اس کا استعمال کیا جائے یا نہیں اس سلسلے میں مکمل معلومات نہیں ہیں۔ اس لیے باخبر رضامندی (informed consent) حاصل کرنا ممکن نہیں، اور سائنس کی اخلاقیات کا یہ سب سے اہم پہلو ہے۔ یعنی کسی بھی سائنسی طریقۂ کار کو استعمال کرنے سے پہلے جو بھی یا جس پر بھی وہ طریقہ استعمال ہو رہا ہو اُسے اس کے فوائد و نقصانات معلوم ہونے چاہئیں۔

* جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، یہ ٹیکنالوجی ممکنات کی ایک پوری دنیا اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، چنانچہ اس کے استعمال کی حدود کیا ہوں؟

امراض کے علاج کے سلسلے میں بھی اسے کس حد تک استعمال کیا جا سکتا ہے؟ مثلاً کسی انسان کے خلیات میں اس ٹیکنالوجی کا استعمال کر کے تبدیلی کی جاتی ہے۔ لیکن اگر یہ تبدیلی اس کے مادہ منویہ (sperm) میں بھی کی جائے تو اس کا اثر اس کی اگلی نسل پر بھی پڑے گا۔ کیا اگلی نسل میں کسی

برے اثر کو منتقل کرنے کا حق ہمیں ہے؟

* مادہ منویہ اور بیضہ میں اس ٹیکنالوجی کا استعمال کس حد تک کیا جاسکتا ہے؟

* علاج و معالجہ سے آگے بڑھ کر اور دوسرے خصائص کو انسانوں یا جانوروں میں پیدا کرنے کے لیے اس ٹیکنالوجی کے استعمال کی حدود کیا ہوں؟

* اس ٹیکنالوجی سے پوری دنیا کے لوگ برابری کے اعتبار سے مستفید ہوں، اس بات کی ضمانت کیسے دی جائے گی؟

مندرجہ بالا حیاتیاتی اخلاقیات کے نکات سے کئی قسم کے سوالات کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مثلاً: ٹیکنالوجی کے استعمال کی حدود کون طے کرے گا؟ اور جو بھی آج طے کررہا ہے وہ ان کے نفاذ میں اکثر ناکام ہے تو پھر اس کا نفاذ کیسے ممکن بنایا جائے؟ ان حدود کے طے کرنے میں کن اصولوں کو مدنظر رکھا جائے گا؟ سیکولر ہیومنزم کے وہ اصول (مختصراً) جن کے اعتبار سے یہ مانا جاتا ہے کہ ٹیکنالوجی ایسی ہو جس سے

- ماحول کو نقصان نہ پہنچے - انسانوں اور دیگر جان داروں کو نقصان نہ پہنچے
- ٹیکنالوجی پائیدار ہو

کے باوجود مختلف قسم کے جی ایم او وجود میں آچکے ہیں جو ان اصولوں کی دھجیاں اڑا رہے ہیں۔ چنانچہ نفاذی قوت اور اصول دونوں جہتیں حیاتیاتی اخلاقیات کے میدان میں نئی سوچ کی منتظر ہیں، کیونکہ حیاتیاتی اخلاقیات کے علی الرغم بعض چوٹی کے سائنس دان یہ کہہ رہے ہیں کہ کرسپر ٹیکنالوجی کے ذریعے ہر قسم کے تجربات کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے، چاہے وہ جینیاتی ترمیم سے انسانی بہتری ہی کے تجربے کیوں نہ ہوں! بقول ایک مشہور و معروف جینیاتی ماہر کے بہت زیادہ جانچ کے بعد اگر ٹیکنالوجی محفوظ ثابت ہوتی ہے تو پھر اس کا ہر میدان میں استعمال کیا جانا مناسب ہے۔

انسانی جنین میں اس ٹیکنالوجی کے استعمال کے ذریعے تبدیلی فی الوقت حیاتیاتی اخلاقیات کے ضابطے کے خلاف ہے۔ لیکن جو کچھ چین میں ہوا وہ اس بات کا واضح اظہار ہے کہ اس طرح کا ضابطۂ اخلاق خاص قسم کے رویوں پر کنٹرول چاہتا ہے اور یہ کنٹرول مخصوص نظریۂ حیات (ورلڈ ویو) کو ماننے کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح کے ضابطۂ اخلاق کی پامالی سے ظاہر ہوتا ہے

کہ موجودہ ورلڈ ویو رویے پر کنٹرول کرنے میں ناکام ہو چکا ہے۔

سیکولر ہیومنسٹ ورلڈ ویو کی بنیاد بالطبع اضافی ہے۔ ان بنیادوں پر کھڑی حیاتیاتی اخلاقیات کی عمارت بہت کمزور ہے۔ اس لیے کچھ ابدی بنیادوں کی ضرورت ہے۔

کرسپر ٹیکنالوجی اسلامی نقطۂ نظر سے

ٹیکنالوجی کے اسلامی ورلڈ ویو پر لکھا گیا ہے، لیکن وہ بہت عمومی نوعیت کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ٹیکنالوجی بالعموم اور جینیاتی ایڈیٹنگ کی ٹیکنالوجی (یا سالماتی حیاتیاتی ٹیکنالوجی) بالخصوص بہت تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی نقطۂ نظر سے غیر معمولی دقتِ نظر اور اجتہاد کی ضرورت درپیش ہے۔ بعض مسلم محققین اس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

ٹیکنالوجی کے اسلامی نقطۂ نظر کے لیے ہم جب قرآن کو اصولی رہنمائی کے لیے کھولتے ہیں تو درج ذیل نکات بڑی صراحت کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ یہ نکات ہمیں بالعموم ٹیکنالوجی اور بالخصوص جینوم ایڈیٹنگ کی ٹیکنالوجی کو منضبط (regulate) کرنے کے لیے اصولی رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

* لا تفسدوا فی الارض (زمین میں فساد برپا نہ کرو): فساد ایک وسیع الاطراف لفظ ہے۔ ہمارے نزدیک کرسپر ٹیکنالوجی میں بالطبع اس بات کی صلاحیت موجود ہے کہ وہ محدود پیمانے پر یا غیر منضبط ہونے کی صورت میں لامحدود پیمانے پر فساد فی الارض کا سبب ہو جائے۔ مثلاً جینیاتی ترمیم سے انسانی بہتری کا حقیقی خطرہ۔ اس ٹیکنالوجی سے انسانی جنین میں بہت ساری ایسی تبدیلیاں کی جاسکتی ہیں جن کا اس سے پہلے تصور بھی ممکن نہیں تھا۔ مثلاً ایسے جنگجو انسانوں کی تخلیق جن میں رحم کا جذبہ سرے سے غائب ہو۔ ایسے سائی بورگ (انسان اور مشین کو ملا کر تخلیق کیے گئے انسان) جو بنیادی انسانی احساسات سے عاری ہوں، جیسے محبت، اخوت، ہمدردی جیسے جذبات۔ اب اس طرح کی تخلیقات جب سماج میں عام ہو جائیں گی تو ان کے اثرات انسانی سماج پر کیا ہوں گے اور اس سے کیا کچھ فساد برپا ہوگا اس کا تصور ہی دل دہلا دینے والا ہے۔ اس سے قبل صنفی اختیار (sex selection) کی ٹیکنالوجی سے بطورِ خاص ایشیا میں جو فساد برپا ہوا ہے جس کے اثرات اب ہر طرف دیکھے جاسکتے ہیں وہ ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ ابتداءً بے ضرر اور انتہائی کارآمد ایکسرے

ٹیکنالوجی نے بالآخر کہاں کہاں فساد برپا کیا، وہ ظاہر ہے۔ پورے ایشیا میں مرد و عورت کا وہ تناسب جو فطری طور پر قائم تھا زبردست طریقے سے بدل گیا ہے، اور اس کے لازمی اثرات کا خمیازہ اب پوری نسلِ انسانی بھگت رہی ہے۔ یہ محض ایک مثال ہے۔ اس طرح کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ایکسرے ٹیکنالوجی تو اصلاً بے ضرر تھی، کرسپر بالطبع بے ضرر نہیں ہے۔

* **الا تطغوا فی المیزان** (میزان میں خلل نہ ڈالو): یہ دوسرا تاکیدی نکتہ ہے جو بتاتا ہے کہ انسان کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اللہ کی بنائی ہوئی میزان میں خلل نہ ڈالے۔ میزان ایک بامعنی لفظ ہے جس کا قریب ترین ترجمہ ترازو یا ناپ تول کے تناظر میں لیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن اسے بیلنس کے مفہوم میں بھی استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ انسان کی کوئی بھی سرگرمی اور کوئی بھی ٹیکنالوجی ایسی نہ ہو جو توازن یا بیلنس میں خلل ڈالے۔ ہمارے نزدیک کرسپر ٹیکنالوجی میں یہ امکان بدرجہ اتم موجود ہے کہ وہ توازن میں خلل ڈال سکے، بلکہ دیگر ٹیکنالوجیوں کے مقابلے میں یہ ٹیکنالوجی اس بات کا زیادہ امکان رکھتی ہے۔ کیڑے مکوڑے، حشرات، پودے جو بظاہر نقصان دہ ہیں ان کی تخلیق اور ان کے تناسب کا بھی ایک توازن ہے۔ اس میں بھی خلل اندازی سے بالآخر میزان میں خلل پڑتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پھر موذی جانوروں اور موذی حشرات وغیرہ کو بھی نہیں مارنا چاہیے۔ ایک سیب بھی نہیں توڑنا چاہیے کہ یہ بھی میزان میں خلل ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ انسانی مصالح و مفاسد کے پیش نظر جن چیزوں میں جس قدر تصرف کی اجازت ہے ایسی ٹیکنالوجی کا عمل اس حد تک مباح رہے گا۔ شریعت کا ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ ''مضرت'' (نقصان) اور ''منفعت'' (فائدہ) میں تناسب کو ہمیشہ مدِنظر رکھا جائے گا۔ یعنی اگر نقصان بہت زیادہ ہو تو ایسے کسی فعل یا ٹیکنالوجی کو اختیار نہیں کیا جائے گا۔ اگر فائدہ نقصان کے مقابلے میں زیادہ ہوگا تو ایسے کسی فعل اور ٹیکنالوجی کو احتیاط سے اختیار کیا جائے گا اور یہ صورت میزان میں خلل ڈالنے والے نکتے سے مستثنیٰ رہے گی۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ حشرات جو فصلوں یا انسان کو نقصان پہنچاتے ہیں اُن کے ذریعے پہنچائے جانے والے نقصان کو کم سے کم کیا جائے، نہ کہ ان کی انواع کا خاتمہ کیا جائے، (اسی لیے اگر مچھر دانی کا استعمال کر کے مچھروں سے بچا جا سکتا ہو تو مچھر کش دوائی کی ٹیکنالوجی کا استعمال نہیں کیا جانا چاہیے)۔ کرسپر ٹیکنالوجی انواع کا صفایا کرنے کا ایک اہم ذریعہ

ہے۔ یہ مضر جان داروں (حشرات، بیکٹیریا، پودے) میں ایسے جینز داخل کرسکتی ہے جو بالآخر ان کی انواع کا صفایا کردیں گے۔ لیکن ان انواع کا صفایا کس طرح سے نئی انواع کو جنم دے گا جو ہوسکتا ہے ان سے بھی زیادہ خطرناک ہوں اس کا کوئی میکنزم ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ اس کی منفعت اس کے نقصان سے بہت کم رہ جائے۔

* **الذی خلق فسوی** (وہی ہے جس نے تخلیق کی اور تناسب قائم کیا): تخلیق اور تناسب اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے، وہ بہتر طور پر جانتا ہے کہ خلق کیسی ہو اور اس کا تناسب کیا ہو۔ کس خطے میں کیسا تناسب ہو، اور کس خطے میں کیسی مخلوق ہو، اور ان کے خصائص کیا ہوں۔ مخلوقات اور تناسب محض ماحول اور فطری انتخاب اور تنازع للبقاء کے نتیجے میں وجود میں نہیں آئے ہیں۔ یہ تنوع اور اس کی تشریح مذکورہ تینوں جہات کے علاوہ اور بھی جہات کی متقاضی ہے۔ چنانچہ ایسی کوئی ٹیکنالوجی یا انسانی فعل جو اس "تسویۃ" پر اثر انداز ہوگا وہ قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

کرسپر ٹیکنالوجی بالاصل اس بات کے لیے ذمہ دار بنے گی کہ اس تناسب میں بگاڑ آجائے۔ مثلاً مخصوص جلد کی رنگت والے لوگ، آنکھوں کے مخصوص رنگ والے، مخصوص جثہ وجسامت والے لوگ، مخصوص ذہن رکھنے والے لوگ۔ غرض ہر خاصّے کے لیے ایک تناسب ہے۔ اب ظاہری بات ہے کہ اس ٹیکنالوجی کا استعمال کرکے زیادہ ذہانت (آئی کیو) کے حامل بچوں کے حصول کے لیے عوام میں ایک دوڑ لگ جائے گی۔ امریکہ میں پہلے ہی ایسے اسپرم عطیہ دہندگان (sperm donors) کی بہت مانگ ہے جن کا آئی کیو زیادہ ہو، یا جو پی ایچ ڈی سند یافتہ ہوں۔ بیضہ سے بارآور کرکے کرائے کی بچہ دانی (surrogacy) سے کوئی بھی ماں/ باپ بننے کا شرف حاصل کرسکتا ہے۔

چنانچہ ڈیزائنر بے بی اب محض خواب نہیں ہے۔ امریکہ ویورپ میں بعض سپرم/ بیضہ بینک ایسی تفصیلات کو جن کے ذریعے بہتر بچے کا حصول ہوسکتا ہے جیسے زیادہ ذہانت، نیلی آنکھیں، اونچا قد، مخصوص نسل، اونچی قیمت پر بیچتے ہیں۔ حالانکہ اس طرح کے بیضہ اور اسپرم کے ملاپ سے ان خصوصیات والا بچہ پیدا ہو، ایسا ضروری نہیں ہوتا بلکہ اس میں کچھ ناکامی کے بھی امکانات ہوتے ہیں۔ لیکن باور کیا جاتا ہے کہ کرسپر ٹیکنالوجی کے ذریعے ایسے بچوں کے حصول میں ناکامی کے امکانات صفر کی حد تک ہوجائیں گے۔ چنانچہ وہ خلق اور تناسب جو اللہ کے لیے خاص ہے اس میں

ہم مداخلت کریں گے، اور یہ بات بگاڑ کا ہی سبب بنے گی۔

* اسلامی شریعت کا ایک اصول "لاضرر ولا ضرار" کی صورت میں مشہور و معروف ہے۔ حالانکہ لفظ "ضرار" کے مفہوم میں محققین میں اختلاف ہے، لیکن "ضرار" کا ایک مفہوم جانتے بوجھتے ہوئے نقصان پہنچانے کا بھی ہے۔ کرسپر ٹیکنالوجی کو اگر غیر منضبط رکھا جائے یا اسے عوام و خواص سب کے لیے یکساں طور پر ہر فیلڈ میں ہر طرح کی تبدیلی کے لیے، ہر قسم کے جان داروں میں تبدیلی کے لیے، انسان کے خصائص بدلنے کے لیے، سائی بورگ اور humanoide اور negative enhancement کے لیے کھلا رکھا جائے تو یہ انسان اور ماحول دونوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی، اور یہ محض اندازہ نہیں ہے، بلکہ دیگر جینوم ایڈیٹنگ کی ٹیکنالوجی کے ذریعے بنائے گئے جینیٹکلی ماڈیفائڈ آرگنزم (تبدیل شدہ جینیات) پہلے ہی سے دردِ سر بنے ہوئے ہیں اور ان کے نقصانات سامنے آنے لگے ہیں (بہت ہی عام مثال بی ٹی کاٹن ہے۔) چنانچہ "لاضرار" کے تحت ہم اس ٹیکنالوجی کے بے لگام استعمال کے قائل نہیں ہو سکتے۔

کرسپر ٹیکنالوجی کے تناظر میں اسلامی نقطۂ نظر کے مذکورہ بالا مقدمے سے اس ٹیکنالوجی کی اسلامی اخلاقیات کے ضمن میں درج ذیل نکات اخذ کیے جا سکتے ہیں:

ٹیکنالوجی بقدر ضرورت ہو: حالانکہ یہ پہلو minimalist افراد بھی پیش کرتے ہیں، لیکن اسلام بطور خاص اسراف کے معاملے میں بہت حساس ہے۔ چنانچہ ہر وہ ٹیکنالوجی جو ضرورت کے فریم سے آگے بڑھتی ہوا ُس کا استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ضرورت خود ایک اضافی شے ہے لیکن اس ٹیکنالوجی کے سلسلے میں یہ اضافی نہیں رہی۔ صرف ایک مثال ملاحظہ فرمائیے:

اس ٹیکنالوجی کے ذریعے جین ڈرائیو استعمال کر کے فصلوں کو نقصان پہنچانے والے حشرات کا صفایا کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ غیر ضروری ہے۔ کیونکہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اور اب تقریباً ثابت شدہ ہے کہ ماحولیاتی توازن میں ہر شے کا اپنا رول ہے۔ جب ہم جین ڈرائیو کے ذریعے مکمل طور پر اس کی انواع کا صفایا کریں گے تو بالکل نئی قسم کے انواع کے وجود میں آنے کا حقیقی خطرہ ہے۔ اس کے جواب میں مخالفین یہ کہتے ہیں کہ پھر کیا فصلوں کو برباد ہونے دیں اور انسان کو بھوکا مرنے دیں؟ ہمارا جواب ہے کہ نہیں، جین ڈرائیو اور کرسپر کا استعمال کر کے ان حشرات کی انواع کا صفایا کرنے کی بجائے حشرات سے integrated pest management کا

استعمال کیا جائے جو فصلوں کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔اس میں انواع مکمل تباہ نہیں ہوتیں اور فصلوں کا نقصان نسبتاً بہت کم ہو جاتا ہے۔

کرسپر ٹیکنالوجی میں ظاہری خواص تبدیل کیے جاسکتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک ایسا کرنا واضح طور پر غلط ہے کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے مخلوق کی ساخت میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی اور نہیں کی جانی چاہیے۔

جنین میں بیماری کے لیے ذمہ دار جین درست کیے جا سکتے ہیں لیکن اُس وقت جب اس سے نقصان کا اندیشہ اس کے فائدے سے بہت کم ہو۔ یہاں پر ایک پیچیدہ سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ بیماری کے جین سے بیماری پیدا ہوتی ہے جس سے اذیت ہوتی ہے لیکن ایک سفید فام تہذیب میں کالا ہونا بھی اذیت کا باعث ہے۔ایک جسمانی اذیت ہے، دوسری نفسیاتی۔تو بیماری کے جین اگر درست کرنے کی اجازت آپ دیتے ہیں تو جلد کی رنگت کی تبدیلی کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟ بالآخر دونوں صورتوں میں جین کی وجہ سے مستقبل میں اذیت ہی تو ہوگی۔ دونوں صورتوں میں آپ مخلوق کی ساخت میں تبدیلی کر رہے ہیں۔ یہاں مثبت انسانی جینیاتی ترمیم اور منفی انسانی جینیاتی ترمیم کی بحثیں ہیں، جن کا یہ مضمون متحمل نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک اس طرح کے پیچیدہ سوالات کا کافی وشافی جواب موجود ہے بلکہ بعض تشریعی اصول تو اس طرح کے معمہ جاتی نوعیت کے سوالات کا شاندار جواب دیتے ہیں۔

یوجینکس اور انسانی جینیاتی ترمیم دراصل انسان کے خود کو مختارِ کُل سمجھنے کے نقطۂ نظر کا اظہار ہے۔جبکہ اسلامی نظریے کے مطابق مختارِ کُل صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔اس لیے اس طرح کی کسی بھی ٹیکنالوجی کے استعمال کی اجازت نہیں ہوگی جو بالآخر یوجینکس اور انسانی جینیاتی ترمیم پر منتج ہو۔

کرسپر کے ذریعے ایسے پودوں کی تخلیق جو موجود پودوں کی بعض انواع کو ہٹا کر ماحول میں امپلانٹ کی جائیں گی، اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

کرسپر کے ذریعے somatic cells میں تبدیلیوں کی گنجائش محض جینیاتی امراض کی حد تک ہوگی۔

واضح رہے کہ ٹیکنالوجی کی اخلاقیات کا یہ بیانیہ کرسپر ٹیکنالوجی کو مکمل طور پر رد کر دینے یا اس ٹیکنالوجی میں مزید تحقیقات کو بند کر دینے کے موقف جیسا بالکل نہیں ہے جیسا کہ متشدد عیسائی تخلیق پسند بیانیے کے ماننے والے یا الٹرا آرتھوڈوکس یہودی حضرات کا ماننا ہے، بلکہ یہ بیانیہ اس ٹیکنالوجی کو صحیح سمت دینے اور اسے زیادہ بہتر طور پر منضبط کرنے کے لیے ٹھوس بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ یہ

ٹیکنالوجی کی اخلاقیات میں خالق ومالک کے تئیں احساسِ ذمہ داری اور اس کے سامنے پیش ہونے کے تصور کو جگہ دیتا ہے۔ اور اس ٹیکنالوجی کو اپنی عقلِ محض یا ہوائے نفس کا استعمال کر کے زحمت بنانے کی بجائے وحی کی رہنمائی میں اپنی عقل کا درست استعمال کر کے رحمت بنانے پر زور دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کرسپر ٹیکنالوجی اور اس سے وابستہ اخلاقیات اور حیاتیاتی اخلاقیات ایک وسیع تر سائنس ہے۔ اس سائنس میں اسلامی نقطہ ہائے نظر کو پروان چڑھانا بے حد ضروری ہے۔ بطور خاص جبکہ دنیا میں ''قوانین'' اور معیارات کی دلچسپ بحث چھڑ چکی ہے۔ کہیں قوانین ہیں تو معیارات غائب ہیں، کہیں معیارات ہیں تو قوانین ندارد ہیں۔ کہیں دونوں موجود ہیں تو ان کے نفاذ کی بنیادیں بہت کمزور ہیں۔

قرآن حکیم کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ وہ قوانین بھی دیتا ہے اور معیارات بھی، اور ان کے ساتھ ان کے عملی نفاذ کی ٹھوس بنیادیں بھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ نسل تدبرِ قرآن اور تدبرِ سیرت کی اپنی ذمہ داری پوری کرے اور دنیا کو اس کی روشنی سے منور کر دے (' زندگی' نو' دہلی)۔

بقیہ: تعلیم۔ سیکولر لابی اور اقلیتوں کا کردار

دوسری طرف صورتِ حال یہ ہے کہ اسلامی اور پاکستانی محاذ پر مکمل خاموشی ہے۔ کوئی ایک بھی اسلامی تنظیم، تعلیمی انجمن اور سیاسی جماعت بلکہ دینی سیاسی جماعت ایسی نہیں ہے جس نے حکومت کے سیکولر، لبرل تعلیمی اقدامات کا نوٹس لیا ہو۔ ' البرہان' کی واحد آواز ہے جو پوری قوت اور پورے دلائل کے ساتھ حکومت کی حماقت اور سیکولر لبرل لابی کی چیرہ دستی کو ننگا کر رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وطن عزیز کے اسلامی حلقوں نے تعلیم کے شعبے میں سیکولر لبرل پالیسی کو قبول کر لیا ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اپنا ہی لیا ہے۔ انگریزی کی بالادستی، تعلیم میں کمرشلزم، مخلوط تعلیم، مغربیت کی بالادستی، یہ سب کچھ واضح طور پر بتا رہا ہے کہ ملک کی اسلامی قوتوں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور مفاد پرستی، زر پرستی اور مغربی بالادستی کو قابل قبول بنا دیا ہے۔ جب نئی نسل کی تعلیم و تربیت سیکولرزم کے حوالے کر دی گئی تو کہاں کا اسلامی نظام اور کہاں کا نظامِ مصطفیٰ؟ نعرے لگتے رہیں گے، ریلیاں اور جلوس ہوتے رہیں گے، حلوے مانڈے چلتے رہیں گے اور سیکولرزم ولبرلزم اپنا راستہ بناتے رہیں گے۔ حد یہ ہے کہ بعض معروف اسلامی تعلیمی ادارے مالی مفادات کی خاطر وفاقی وزارتِ تعلیم کی ان غیر اسلامی سرگرمیوں میں معاونت کر رہے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الباب.

دینی تحریکیں

ڈاکٹر محمد امین

ایک ہمہ جہت نئی دینی اصلاحی تحریک کی ضرورت
برائے اصلاحِ فکر و عمل

یہ تحریر ہماری کتاب ''پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں۔ایک فکری تجزیہ'' کا خلاصہ ہے۔اس کے باوجود مناسب محسوس ہوتا ہے کہ اس تلخیص کا بھی نچوڑ ابتداء میں دے دیا جائے تا کہ قاری کو کچھ اندازہ ہو جائے کہ ہم کیا کہنا چاہتے ہیں۔

ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ پاکستان کی دینی قوتوں کی کے مناہجِ عمل، جو مبنی بر اجتہاد تھے، فکری لحاظ سے کمزور تھے اور عملی لحاظ سے غیر مؤثر ثابت ہوئے ہیں اور اپنے پیش نظر اہداف حاصل نہیں کر سکے۔لہٰذا ناگزیر محسوس ہوتا ہے کہ ان پر نظرِ ثانی کی جائے اور متبادل متوازن، مناسب اور مؤثر مناہجِ عمل وضع کیے جائیں۔یہ اصلاح فکر میں بھی مطلوب ہے اور عمل میں بھی۔اس کے لیے ایک نئی ہمہ جہت دینی اصلاحی تحریک کی ضرورت ہے جس کے پیش نظر صرف اصلاح ہو، انفرادی زندگی میں بھی اور اجتماعی زندگی (معاشرہ و ریاست) میں بھی۔اس مجوزہ تحریک میں ہر وہ مسلمان شامل ہو سکتا ہے جو اپنی اصلاح کرنا چاہتا ہو یا دوسرے افراد اور اداروں (معاشرہ و ریاست) کی اصلاح کا متمنی ہو، خواہ اس کا تعلق کسی بھی دینی سیاسی جماعت، تنظیم، ادارے یا مسلک سے ہو۔

پہلے اس مجوزہ اصلاحی تحریک کا ایک ابتدائی تعارف پیش کیا جائے گا اور پھر اس کے لائحہ عمل اور اس کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی جائے گی۔

مجوزہ اصلاحی تحریک کا ابتدائی تعارف

اساسی بیانیہ

۱۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے کہ ہم نے انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت (پرستش و اطاعت) کریں[1]۔

---

[1] ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ الذاریات ۵۱:۵۶

جب ہم نے اسلام قبول کیا ہے اور مسلمان بننا اور رہنا چاہتے ہیں تو قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ ہم دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کی مرضی اور ہدایت کے مطابق گزاریں تاکہ اخروی زندگی میں اللہ ہم سے راضی ہو جائے اور ہمیں اپنی خوشنودی اور نعمتوں سے نوازے۔ (۱)

۲۔ دنیا میں ہماری زندگی انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ انفرادی زندگی اگر ہم اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق گزاریں گے تو اس کا نتیجہ نکلے گا دنیا میں اطمینان قلب (۲) اور آخرت میں کامیابی (۳)۔ لیکن اگر ہم مسلمان بحیثیت مجموعی یعنی ہماری اکثریت دنیا میں اللہ کی رضا کی زندگی گزارے گی تو اس کا نتیجہ نکلے گا دنیا میں بھی کامیابی اور غلبہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ''تمہی غالب رہو گے اگر تم (سچ مچ) مومن ہو'' (۴) اور یہ کہ ''ہم نے زبور میں (بھی) ذکر کے بعد لکھ کر بتا دیا تھا کہ زمین میں غلبہ اس کے صالح بندوں ہی کا ہو گا'' (۵) چنانچہ ایک فرد سے شروع ہونے والا سفر حق آپ ﷺ اور آپ کے تیار کردہ افراد کی ۲۳ سالہ جدوجہد کے نتیجے میں اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست کے قیام پر منتج ہوا اور خلفاء راشدین ۲۰ سال سے بھی کم عرصے میں اس وقت کی دو سپر پاورز پر اور زمین کے بڑے حصے پر غالب آ چکے تھے۔ اسی نور کے امتداد سے مسلمان اگلے بارہ سو سال تک دنیا پر میرٹ پر غالب رہے۔

۳۔ دنیا میں مسلمانوں کی کامیابی اور غلبے کی وجہ ان کی ایمانی طاقت تھی جس کی وجہ سے ان کے اندر انسانی صلاحیتوں اور قوتوں کا ایسا جوار بھاٹا پھوٹا کہ وہ قطع اسباب میں دنیا کی ساری

---

(۱) ﴿يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ﴾ التوبہ ۹:۲۱، ﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ﴾ الحشر ۵۹:۸

(۲) ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ الرعد ۱۳:۲۸

(۳) ﴿لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا﴾ الفتح ۴۸:۵

(۴) ﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ آل عمران ۳:۱۳۹

(۵) ﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ﴾ الانبیاء ۲۱:۱۰۵

قوموں سے آگے نکل گئے۔

۱۲۰۰ سال بعد ان کو زوال آیا تو اس کی بنیادی وجہ ان کا ضعف ایمان تھا جس کی وجہ سے وہ بے صلاحیت، بے کردار اور پسماندہ ہو کر رہ گئے، اگرچہ اس زوال کے دوسرے اہم اسباب بھی تھے۔

۴۔ فرد میں ایمان کی قوت کیسے پیدا ہوتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اپنے آخری پیغمبر (ﷺ) کے بارے میں چار دفعہ فرمایا کہ اللہ نے انہیں "يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ" کا لائحہ عمل دیا تھا[۱]۔ پہلے انبیاء کرام کے بارے میں بھی اس نے بتایا کہ انہیں بھی یہی نسخہ لوگوں کی اصلاح اور انہیں سچا مسلمان بنانے کے لیے اللہ نے دیا تھا[۲]۔

۵۔ آپ ﷺ نے دین کو غالب کر دیا اور اسلامی معاشرہ اور ریاست قائم کر دی اور وہ اس وقت سے لے کر آج تک یعنی پچھلے چودہ سو سال سے تسلسل کے ساتھ قائم اور موجود ہے، سوائے اندلس کے ایک استثنیٰ کے، اور وہاں سے بھی اب اذانوں کی آوازیں ابھرنا شروع ہو گئیں ہیں۔ مطلب یہ کہ ہمیں مسلم معاشرے اور ریاست کو عدم سے وجود میں نہیں لانا بلکہ وہ موجود ہیں اور ہمارا کام یہ ہے کہ ان کی اصلاح کی کوشش کرتے رہیں تا کہ وہ قرآنی و نبوی ماڈل کے قریب تر آتے چلے جائیں۔

حالاتِ حاضرہ

۱۔ ہم متعدد عوامل خصوصاً نظام تعلیم (و دعوت) و تزکیہ کی کمزوری کی وجہ سے ایمانی طاقت (اور تعمیر شخصیت و کردار) میں ضعف کا شکار ہوئے۔ دوسری طرف عالم کفر کا ایک بڑا سیلاب مغربی فکر و تہذیب اور اس کے علمبردار ممالک کی صورت میں اٹھا۔ یہ تہذیب اگر مبنی بر الحاد اور نقیض اسلام تھی تو اس کے علمبردار ممالک اسلام اور مسلم دشمن تھے۔ چنانچہ انہوں نے مسلم ممالک اور معاشروں کو لوٹا، کچلا، غلام بنایا اور انہیں مستقبل میں غلام بنائے رکھنے کی کامیاب پلاننگ کی۔ یوں دوسری جنگ عظیم اور مسلمان ممالک کی بظاہر آزادی کو پون صدی گزر چکی لیکن مسلم حکومتوں اور

---

[۱] البقرہ ۲: ۱۲۹، ۱۵۱، آل عمران ۳: ۱۶۴، الجمعہ ۶۲: ۲

[۲] الاعلیٰ ۸۷: ۱۴ تا ۱۹، النازعات ۷۹: ۱۷ تا ۱۹

معاشروں کی اکثریت آج بھی بڑی حد تک مغرب کی فکری اور عملی غلام ہے اور جو سر اٹھانے کی کوشش کرتا ہے، اسے کچل دیا جاتا ہے۔ اسلامی قوتوں کو ناکام بنانے کا مضبوط نظام بھی انہوں نے قائم کر رکھا ہے۔

۲۔ جو اصلاحی کوششیں اس دوران ہوئیں انہوں نے کچھ کام کیا لیکن بحیثیت مجموعی اپنے اہداف حاصل نہیں کر سکیں۔

❁ تعمیر فرد، معاشرہ اور ریاست کا کوئی مؤثر پروگرام اس وقت تک روبہ عمل نہیں لایا جاسکتا جب تک:

۔ زوال کے اسباب کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لے کر بنیادی اسباب کا تعین نہ کیا جائے اور ان کے ازالے اور اصلاح کا کام نہ کیا جائے۔

۔ مسلم فرد، معاشرے اور ریاست کے اکثر عناصر [عامۃ الناس، پڑھے لکھے لوگ اور پروفیشنلز (انجینئرز، ڈاکٹرز، وکیل، پروفیسر، صحافی، ادیب، دانشور وغیرہ)، حکمران طبقے (سیاستدان، بیوروکریسی، عدلیہ، فوج) اور دینی عناصر (علماء کرام، دعوتی تحریکیں، دینی سیاسی جماعتیں، دینی مدارس، مساجد، تصوف کے حلقے وغیرہ)] یا تو مغرب کی الحادی فکر وتہذیب سے مرعوب ومتاثر ہو گئے ہیں یا اس کے ردِّعمل کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس لیے دینی قوتیں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتیں جب تک وہ مغربی فکر وتہذیب کے ردّ اور اس کی جگہ اسلامی اصول واقدار پر عمل اور غلبے کی اپروچ پر عمل نہیں کرتیں۔

پس چہ باید کرد

اس صورت حال کا حل یہ ہے کہ:

❁ بگاڑ کی ذمہ دار داخلی اور خارجی قوتوں کا صحیح صحیح تعین کیا جائے۔

❁ موجودہ اصلاحی قوتوں کے غیر مؤثر ہونے اور ان کی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے۔

❁ اور اصلاح کے لیے ایک نئی تحریک کھڑی کی جائے جو موجودہ اصلاحی قوتوں کو ان کی

کمزوریوں اور خامیوں کی طرف متوجہ بھی کرے اور جو کام صحیح رُخ پر نہیں ہو رہے، انہیں صحیح رُخ سے کرنے کی نشاندہی بھی کرے بلکہ اس پر عمل کی کوشش بھی کرے۔

❁ یہی اصلاحی کام کرنے کے لیے ایک ہمہ جہت نئی دینی اصلاحی تحریک کی ضرورت ہے۔

مجوزہ اصلاحی تحریک کا مقصد

اس اصلاحی تحریک کا مقصد یہ ہوگا کہ:

❁ وہ ہر مسلمان کو یاد کرائے اور اس کام میں اس کی مدد کرے کہ وہ اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق بسر کرے تا کہ وہ آخرت میں اللہ کی رضا پا سکے اور اس کی نعمتوں کا حق دار بن سکے۔

❁ فرد کے ساتھ ہی اجتماعی زندگی کی اصلاح بھی ضروری ہے۔ اگرچہ اجتماعی زندگی کو بھی افراد ہی چلاتے ہیں اور فرد کی اصلاح کا منطقی نتیجہ اجتماعیت کی اصلاح ہی ہے تاہم معاشرے اور ریاست کے کردار کی وسعت اور دینی اہمیت کے پیش نظر ان کی براہ راست اصلاح کی کوششیں بھی ضروری ہیں۔ اسلام میں اظہارِ دین، اعلاء کلمۃ اللہ اور جہاد کے حکم کا مطلب یہی ہے کہ دعوت واشاعت دین اور نفس کے تزکیہ کے ذریعے نہ صرف فرد کی تعمیر سیرت کی جائے بلکہ معاشرہ اور ریاست بھی وہ کردار ادا کریں جو انہیں شریعت نے تفویض کیے ہیں۔

طریق کار

مجوزہ اصلاحی تحریک فرد، معاشرے اور ریاست کی اصلاح کا یہ کام پر امن طریقے سے تعلیم وتزکیہ اور دعوت واصلاح کے ذریعے کرے گی تا کہ اذہان وقلوب کی اصلاح کے ذریعے انفرادی واجتماعی زندگی کی اصلاح ہو سکے۔ یاد رہے قرآن حکیم کے مطابق اصلاح بذریعہ تعلیمِ کتاب وحکمت وتزکیہ ہی ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے مبعوث کردہ انبیاء کرام اور خصوصاً آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کا طریق کار رہا ہے۔ تاہم معاشرے کی اصلاح کے لیے امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور ریاست وسیاست کی اصلاح کے لیے سیاسی جدوجہد کی خاطر تنظیم سازی کی جاسکتی ہے۔

منہج ومشرب: اطاعت قرآن حکیم وسنت رسول ﷺ، اتباع صحابہ واسلاف، ائمہ جمہور کی آراء کا احترام، زوال مسلم سے سبق سیکھنا اور مغربی فکر وتہذیب کو رد کرنا۔

ذرائع: تحریر وتقریر، اشاعت لٹریچر، میڈیا، انفرادی ملاقاتیں، تربیت گاہیں۔ فرد، معاشرے اور ریاست کے لیے حسبِ ضرورت تنظیم سازی۔

اسلوب: ''ہمارا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے'' کے اصول پر عمل۔ اگر دوسروں پر نقد مجبوری ہوتو وہ بھی نرمی، شرافت، حلم اور مدبرانہ انداز میں۔

تعاون

ہر وہ مسلمان جسے تحریک کے نظریات سے اتفاق ہو یعنی وہ اپنی اصلاح کر کے خود اچھا مسلمان بننا چاہتا ہو اور دوسروں کو بنانا چاہتا ہو، وہ مجوزہ اصلاحی تحریک میں شامل ہوسکتا ہے اور اس کا معاون بن سکتا ہے، خواہ اس کا تعلق کسی بھی سیاسی یا دینی فکر، جماعت، تحریک، تنظیم اور ادارے سے ہو۔

مجوزہ اصلاحی تحریک کا لائحہ عمل

بنیادی اصول

۱۔ دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح کی فکر اور اس کے لیے جدوجہد

۲۔ دوسروں کی اصلاح

دوسروں کی اصلاح کے دو اہم پہلو ہیں:

ایک: موجودہ دینی قوتوں کی اصلاح۔ یعنی ہمارے معاشرے میں دینی عناصر جس طرح سے دعوت وتبلیغ، تعلیم، تزکیہ، سیاست وغیرہ کے شعبوں میں دینی مقاصد کے حصول کے لیے اصلاحی کوششیں کر رہے ہیں، ان کے غیر مؤثر ہونے کی بڑی وجہ ہمارے نزدیک ان کی فکر اور منہج کا ناقص اور غیر متوازن ہونا ہے لہٰذا محبت اور حکمت سے ان کو اس طرف متوجہ کیا جائے۔

دوم: دعوت وتبلیغ، تعلیم، تزکیہ، اصلاح معاشرہ اور سیاست کے شعبوں میں دین کے صحیح، جامع اور متوازن تصور اور نئی حکمت عملی کے تحت اصلاحی جدوجہد کرنا۔

اور اب ان نکات کی کچھ تفصیل:

اپنی اصلاح سے ابتداء

اس موضوع پر غور وفکر اور عمل کے لیے راقم کا تحریر کردہ کتابچہ ''اپنی اصلاح آپ کیسے''

مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ یہاں تلخیصاً اہم نکات کی نشاندہی کی جاتی ہے:

* اپنی اصلاح سے مقصود ہے اچھا اور باعمل (Practicing) مسلمان بننا، اللہ تعالیٰ کی معصیت سے بچنا یا اعلیٰ درجے کا مسلمان بننے کی کوشش کرنا (یعنی درجۂ احسان کا حصول)۔

* یہ اس لیے مقصود ہے کہ ہم 'مسلم' ہیں اور ہم نے اپنی مرضی اور رضا و رغبت سے 'اسلام' قبول کیا ہے۔

اسلام یہ ہے کہ ہم اللہ کے 'عبد' ہیں اور ہمارا کام ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کرنا ہے۔ دنیا میں عبودیت کا یہ رویہ ہمارے لیے ناگزیر ہے تاکہ ہماری دنیا بھی سنور جائے اور آخرت میں بھی اللہ ہم سے راضی ہوجائے اور اپنی نعمتوں سے نوازے اور حقیقی کامیابی تو آخرت ہی کی کامیابی ہوتی ہے۔ یہی کارِ عبودیت ہمارا نصب العین ہے۔

* اسلام کا بنیادی اور اولین مخاطب فرد ہے کہ وہی دنیا میں عبادت و اطاعت کا اور آخرت میں جواب دہی کا مکلف ہے۔ تاہم انسان چونکہ طبعاً اور عملاً اجتماعیت کی زندگی گزارتا ہے یعنی معاشرے اور ریاست کی اور اللہ تعالیٰ نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں کے لیے احکام عطا فرمائے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ فرد نہ صرف اپنی ذاتی زندگی اللہ کی عبادت و اطاعت میں گزارے بلکہ اس کا معاشرتی اور ریاستی کردار بھی اسلامی احکام کے مطابق ہو۔ اس سے ایک طرف یہ ہوگا کہ نظم اجتماعی فرد کے عبودیت کے راستے پر چلنے میں مددگار ہوگا (اور اس میں مزاحم نہ ہوگا) اور دوسری طرف معاشرے اور ریاست کے جو کام اجتماعی سطح پر کرنے کے ہیں جیسے نفاذ احکام شرعیہ، حدود و جہاد وغیرہ، وہ انجام پاسکیں گے۔

* فرد کی اصلاح و تعمیر سیرت کا بنیادی ذریعہ " وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ" کا اصول ہے یعنی تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفس۔ تعلیم میں خصوصی طور پر ایمانیات (توحید، رسالت، آخرت) اور عمومی طور پر دین کے دیگر شعبوں (مثلاً عبادات، اخلاقیات، معاملات) کی دعوت، تبلیغ، انذار، امر بالمعروف و نہی عن المنکر شامل ہیں جب کہ 'دنیاوی تعلیم' کا کتاب اللہ کے مطابق ہونا بھی ضروری ہے۔ نیز تعلیم کتاب و حکمت کا نتیجہ تزکیۂ نفس کی صورت میں نکلنا چاہیے یعنی تعلیم کے ذریعے نفس انسانی کی ایسی تربیت ہو جس سے فرد کے لیے

عبودیت کا رویہ اختیار کرنا سہل اور مرغوب ہو جائے۔

❁ مسلم والدین، معاشرے اور ریاست کی اسلامی ذمہ داری ہے کہ وہ تعلیمِ کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس کے اصول کے مطابق فرد کی ایسی تعلیم وتربیت کریں کہ اس کے لیے عبودیت کا رویہ اختیار کرنا سہل اور مرغوب ہو جائے لیکن اگر وہ اس میں غفلت برتیں تو بھی یہ فرد کی ذاتی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام پر عمل کرے کیونکہ وہ بحیثیت فرد مکلف ہے اور اسے بحیثیت فرد ہی اللہ کے حضور جواب دہ ہونا ہے، چاہے معاشرہ اور ریاست اس کی معاونت کریں یا نہ کریں۔

❁ اگر مسلمان فرد کارِ عبودیت (عبادت واطاعت) میں کمزور پڑے اور معصیت ونافرمانی میں مبتلا ہو تو اس کا حل ہے توبہ یعنی از سرِ نو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع، ندامت کا اظہار، اپنی غلطی کا اعتراف، معافی طلبی اور آئندہ عبودیت کا رویہ اختیار کرنے کی نیت، وعدہ اور عزم۔ توبہ کے دروازہ کی کنجی ہے احساس، احساسِ ندامت۔ یہ احساس کہ میں تو اللہ کا عبد تھا اور میرا کام تو اللہ کی بندگی اور اطاعت تھا، مجھ سے غلطی ہوگئی، نافرمانی ہوگئی، گناہ ہو گیا لہٰذا اللہ سے معافی مانگنی ہے، استغفار کرنا ہے اور دوبارہ بندگی واطاعت کا عہد کرنا ہے۔ یہ احساس بہت قیمتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو توبہ بہت پسند ہے۔ لہٰذا گناہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس کا نتیجہ احساسِ ندامت اور توبہ کی صورت میں نکلنا چاہیے۔

❁ معصیت نتیجہ ہوتی ہے غفلت کا اور غفلت سے بچنے کا بہترین ذریعہ ہے اللہ کا ذکر۔ ذکر سے مقصود ہے تذکیر یعنی اپنے آپ کو یاد دلاتے رہنا اور اس بات کو ذہن وقلب میں تازہ (Refresh) کرتے رہنا کہ اللہ میرا خالق ومالک اور رازق وہادی ہے، مَیں اس کا عبد اور حقیر بندہ ہوں۔ میرا کام اس کی عبادت واطاعت کرنا ہے۔ میرا اللہ بہت بڑا ہے، مَیں اس کے مقابلے میں حقیر ترین ہوں (اللہ اکبر)۔ اللہ تعالیٰ ہر قسم کی لغزش اور کمزوری سے پاک ہے جبکہ مجھ سے معصیت اور غلطی ہوتی رہتی ہے (سبحان اللہ)۔ اللہ نے مجھے ہزاروں نعمتوں سے نواز رکھا ہے لہٰذا اس کا شکر واجب ہے (الحمد للہ)۔ اللہ ایک ہے اس کے سوا کوئی عبادت واطاعت کے لائق نہیں (لا الٰہ الا اللہ) اور ساری طاقتوں کا منبع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جبکہ مَیں کمزور اور اس کا محتاج ہوں اور اس کی نصرت کا طلب گار ہوں (لا حول ولا قوۃ الا باللہ) وغیرہ۔

❁ غفلت ومعصیت سے بچنے کا ایک اور مفید اور مؤثر طریقہ یہ ہے کہ نیک لوگوں کی صحبت

اختیار کی جائے۔صالح اور نیک لوگ وہ ہوتے ہیں جو اللہ کی عبادت واطاعت کرتے ہوں اور اس کی معصیت سے بچتے ہوں۔ایسے لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور رہنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ کی عبادت اور اطاعت کا ماحول ملے گا، آدمی اللہ کے ذکر اور اس کی عبادت واطاعت کا خوگر ہوتا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا امکان کم ہوتا جائے گا۔

❁ اللہ تعالیٰ کی معصیت سے بچنے کا ایک بڑا ذریعہ کتاب اللہ ہے۔اس کی تلاوت کثرت سے کرنا، اس کو صحیح طریقے سے پڑھنا، اس کو سمجھنا اور اس پر عمل کی کوشش کرنا اور جب اللہ تعالیٰ ان باتوں کی توفیق دے تو اسے دوسروں تک پہنچانا۔یہ ایک پورا منہاج ہے، اصلاح وتزکیے کا پورا پیکج ہے لیکن مسلمان عموماً اس کو اہمیت نہیں دیتے، اس نسخے پر عمل نہیں کرتے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ صحیح تعلیم وتزکیہ کا سب سے بڑا منبع اور ماخذ قرآن حکیم ہے۔اس چشمہ ٔ صافی کی موجودگی میں کسی اور حوض کی تلاش ناشکری بھی ہے اور حماقت بھی۔قرآن حکیم سے بڑھ کر تعلیم وتزکیہ کا کوئی مصدر نہیں لہٰذا قرآن حکیم سے جڑنا اور اس کی صحبت اختیار کرنا لازمی ہے۔

❁ قرآن حکیم کی تعلیم کے دو بڑے محور ہیں ایک توحید یعنی اسلام کا تصورِ الٰہ اور دوسرے تصور آخرت۔

۔ توحید کیا ہے؟ توحید اسلام کی جان ہے۔یہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں صحیح تصور اور اسے اس کی ساری صفات کے ساتھ ماننا ہے۔ بلکہ صرف ماننا ہی کافی نہیں، اس پر اتنا پختہ یقین ہونا چاہیے کہ وہ قلب ودماغ میں راسخ ہوجائے اور عمل میں ڈھل جائے۔

تصور الٰہ اور توحید کی حیثیت مرکزی ہے کیونکہ رسول کو ہم رسول اسی لیے مانتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث کردہ ہوتا ہے۔قرآن کو اسی لیے ہم محترم ومقدس مانتے ہیں کہ وہ اللہ کی کتاب ہے۔فرشتوں کو اسی لیے مانتے ہیں کہ وہ اللہ کے کارندے ہیں۔تقدیر کو اسی لیے مانتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے کردہ ہوتی ہے۔

۔ تصور آخرت اسلامی عقائد کا دوسرا بڑا محور ہے یعنی یہ تصور کہ دنیا محل عمل ہے، مزرعۃ الآخرۃ ہے۔ انسان دنیاوی زندگی میں احکام الٰہی پر عمل کرنے کا مکلف ہے اور دنیا گویا دارالامتحان ہے جس کا نتیجہ آخرت میں نکلے گا، جہاں کی زندگی ہمیشہ کی ہے لہٰذا آخرت کو دنیا پر

ترجیح حاصل ہے اور اسی لیے آخرت کی کامیابی کی فکر کرنا اور اسے دنیا پر ترجیح دینا اسلام کا بنیادی ستون ہے۔ انسان کی حقیقی فلاح اس میں ہے کہ وہ دنیا میں عبودیت کا رویہ اختیار کرے تاکہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی نعمتوں سے متمتع ہو سکے۔

❁ اسی طرح صحیح تعلیم وتزکیہ کا ایک بنیادی ماخذ رسول اللہ ﷺ کی سنت وسیرت ہے کیونکہ انسانوں کے لیے محض کتاب ہدایت کافی نہیں ہوتی بلکہ انہیں عبودیت کا ایک عملی نمونہ درکار ہوتا ہے تاکہ انہیں یقین ہو جائے کہ یہ ہدایت قابل عمل ہے اور رسول کی عملی زندگی کو دیکھ کر وہ اس سے انسپائر ہوں اور اس کی اطاعت کا جذبہ ان کے اندر ابھرے۔ لہٰذا سالکِ راہِ حق کے لیے ضروری ہے کہ وہ رسول کریم ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کرے کہ کس طرح آپ ﷺ نے عبادت واطاعت کا حق ادا کیا۔ زندگی کے ایک ایک شعبے میں، ہر چھوٹے بڑے معاملے میں، آپ نے کس طرح کا طرزِ عمل اختیار فرمایا۔ سیرت وسنت پیمبر (ﷺ) کا مطالعہ ایک مومن کا ایمان تازہ کرنے کا بنیادی ذریعہ ہے۔

❁ تعلیم وتزکیہ کے طالب کے لیے آپ ﷺ کے صحابہ کی سیرت کا مطالعہ بھی بہت اہم اور مفید ہے۔ یہ وہ عظیم لوگ ہیں جن کی تربیت خود اللہ کے رسول نے وحی کی ہدایت کی روشنی میں کی۔ ان سے بڑا اللہ کی عبادت واطاعت کا ماڈل اور مظہر کون ہو سکتا ہے؟

اور پھر صحابہ کرامؓ کے شاگردوں کے سوانح۔ یہ وہ پاکیزہ نفوس ہیں جن کی تربیت خود صحابہ کرامؓ نے کی۔ آپ ﷺ نے ان تینوں زمانوں کے بہترین ہونے کی تصدیق فرمائی[1] اور عرب شاعر جریر نے صحیح کہا کہ اے دنیا کے لوگو! ہمارے ان اسلاف جیسے لوگ اگر تمہارے پاس ہوں تو دکھاؤ!

خلاصہ یہ کہ صحیح تعلیم وتزکیہ کے لیے قرآن وسنت کافی ہیں اور دین کے عملی نمونے دیکھنے ہوں تو اللہ کا رسول (ﷺ) اور اس کے تیار کردہ صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) اس کی بہترین مثال ہیں جن کا اتباع ہم آنکھیں بند کر کے کر سکتے ہیں۔

لیکن.... اور یہ "لیکن" بہت بڑا ہے۔

---

[1] صحیح البخاری: ۲۶۵۲

- ہوتا یہ ہے کہ ہم حق کو جانتے ہیں لیکن طبیعت اس پر عمل کرنے پر مائل نہیں ہوتی بقول شاعر ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

کیوں نہیں آتی؟ آیئے اس پر غور کریں۔

- ہم سب جانتے ہیں کہ بھوک چھوڑ کر کھانا صحت کے لیے مفید ہے۔ اس کے باوجود ہم میں سے بہت سے لوگ مرغن غذائیں کھاتے ہیں اور بہت کھاتے ہیں۔ کھا کھا کر موٹے ہوتے جاتے ہیں اور بیمار ہو کر ہسپتال پہنچ جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود کثرتِ اکل نہیں چھوڑتے۔ کیوں؟

- ایک شخص کا معدہ اگر خراب ہو تو اسے آپ ہزار گھی مکھن کھلایئے، اسے فائدہ نہ ہوگا، بلکہ الٹا نقصان ہوگا۔ اس کے برعکس اگر ایک شخص کا معدہ صحیح ہو تو وہ سادہ دال سبزی کھائے تو بھی صحت مند ہوگا۔

❁ ان مثالوں سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟ بلاشبہ قرآن وسنت ہماری صحیح تعلیم وتزکیہ کے لیے کافی ہیں۔ یہ ایک واضح اور محکم اصول ہے جو ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے.... لیکن اگر ہمارا نفس بیمار ہو تو ہم قرآن وسنت کے سنہری اصولوں پر عمل نہیں کر سکیں گے۔ اور ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے، جس طرح کہ بیمار معدے والا اچھی خوراک ہضم نہیں کر سکتا اور گھی مکھن کھا کے صحت مند نہیں ہو سکتا۔

اس بیمار نفس کا علاج کیا ہے؟ اگر آپ توبہ، تلاوت وفہم قرآن، مطالعۂ سیرت واسوۂ رسول (ﷺ) اور مطالعۂ سوانح صحابہ کرامؓ سے اپنے اس مریض نفس کا علاج کر سکیں تو بہت خوب۔ لیکن اگر آپ ایسا نہ کر سکیں اور معصیت سے نہ بچ پائیں تو پھر آپ مجبور ہیں کہ کسی معالج نفس کے پاس جائیں اور اس سے علاج کرائیں۔ اس ماہر نفس کا کام یہ ہے کہ وہ آپ کے نفس کو اس قابل بنا دے کہ آپ برضا ورغبت شریعت کے احکام پر عمل کر سکیں۔

جس طرح ہم جسمانی طور پر بیمار ہوں تو تھوڑے بہت پرہیز سے یا پیناڈول اور کارمینا جیسی چھوٹی موٹی دواؤں سے آرام نہ آئے تو مجبوراً ہم ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں بلکہ کوشش کرتے

ہیں کہ خوب پڑھا لکھا اور تجربہ کار ڈاکٹر ہو۔ تو اسی طرح اگر آپ احکام شریعت پر کماحقہ عمل کر رہے ہوں تو آپ کو کسی ڈاکٹر یعنی مربی ومزکی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں لیکن اگر آپ کوشش کے باوجود معصیت سے بچ نہیں پا رہے اور آپ کو ایمانی صحت عزیز ہے تو مجبوراً آپ کو کسی اچھے معالج نفس کے پاس جانا ہوگا جو شریعت پر چلنے میں آپ کی مدد کرے۔

مریضانِ نفس کے علاج اور تزکیۂ نفس کے خواہش مندوں کی اعانت کے لیے مسلمانوں نے ماضی میں تصوف کے نام سے ایک ادارہ بنایا تھا جو شروع میں صحیح اسلامی بنیادوں پر کام کرتا رہا۔ پھر اس میں بتدریج خامیاں پیدا ہوتی گئیں اور آج اس میں اتنی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں کہ کئی لوگ اس کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ لیکن جو لوگ معصیت میں مبتلا ہیں اور اس دلدل سے باہر آنا چاہتے ہیں اور خود اپنی کوشش سے گناہ سے چھٹکارا نہیں پا سکتے تو ان کی یہ مجبوری ہے کہ انہیں ایسا مربی ملے جو اللہ کی راہ پر چلنے میں ان کی مدد کرے اور انہیں معصیت سے بچائے۔ لہٰذا ایسے مریض نفس کو معالجِ نفس مربی ومزکی ڈھونڈنے کی خوب کوشش کرنی چاہیے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرنی چاہیے اور مل جائے تو اس کی مدد سے اپنی اصلاح کرنے کی بھرپور کوشش بھی کرنی چاہیے۔

ظاہر ہے ایسا معالجِ نفس اگر کوئی خلافِ شریعت حکم دینے والا ہو تو وہ بے کار اور قابل ردّ ہے بلکہ وہ سرے سے معالج ہی نہیں وہ تو خود مریض نفس ہے؛ تاہم اگر وہ متقی، عالم، صالح اور محقق ہے تو یاد رکھنا چاہیے کہ مباحات میں وسیع تصرف اور اجتہاد کی گنجائش ہوتی ہے اور اصول فقہ کا مشہور قاعدہ ہے کہ واجب تک لے جانے والا بھی واجب ہوتا ہے (اور اسی طرح حرام تک لے جانے والا بھی حرام ہوتا ہے) لہٰذا مربی کی ایسی تدبیروں کو (جو خلافِ شریعت نہ ہوں) اگر دین نہ سمجھا جائے، محض علاجِ نفس کے لیے مفید تدبیر سمجھ کر ان پر عمل کیا جائے تو اس میں کوئی ہرج نہیں اور اسے حرام، بدعت اور خلافِ شریعت کہنا صحیح نہیں ہے۔ جس طرح جسمانی علاج میں ہم ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک، یونانی اور آیورویدک طریق علاج میں سے کسی کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فتویٰ نہیں لگاتے، ایسے ہی علاجِ نفس برائے صحتِ ایمان کے طرق ومناہج پر ہمیں ان کے شرعی یا غیر شرعی ہونے کا فتویٰ نہیں لگانا چاہیے الّا یہ کہ ان میں کوئی چیز واضح طور پر خلاف قرآن وسنت ہو اور اس صورت میں، ظاہر ہے، اس کے قابل قبول ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسروں کی اصلاح کیسے؟

اس حوالے سے کچھ اصولی اور بنیادی باتیں:

۱۔ اصلاح کا اسلوب قرآن وسنت کی رو سے 'الأقرب فالأقرب'[۱] کا ہے۔قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا" [التحریم۶۶:۶]یعنی پہلے اپنی اصلاح کرو،اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت کاحق ادا کرو،پھر اپنی آل اولاد کی اصلاح کی کوشش کروتا کہ تم سب آخرت کے عذاب سے بچ سکو۔اس کے بعد فرمایا "وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ ۝" [الشعراء ۲۶: ۲۱۴]یعنی اپنے اعزہ اقارب کو، خاندان والوں کو انذار کرو،ان کو دین کی دعوت دو،ان کا تزکیہ کروتا کہ وہ اسلام کی تعلیمات پرعمل کرنے لگیں۔پھر تیسرے مرحلے میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کوفرمایا کہ "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا"[سبا۳۴:۲۸]یعنی تمہارا پیغامِ اصلاح سب لوگوں کے لیے ہے،سب عالم کے لیے ہے۔

چنانچہ آپ ﷺ کی ساری زندگی ان قرآنی تعلیمات پرعمل کا بہترین نمونہ ہے کیونکہ اس کے سب سے پہلے مخاطب آپ خود تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے فرمایا "یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ۝" [مزمل ۷۳:۱تا۴]چنانچہ آپ (ﷺ) کی کثرت عبادت کا یہ حال تھا کہ رات کو اتنا قیام کرتے کہ پیر سوج جاتے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو رحم آیا اور کہا کہ عبادت کچھ کم کرو۔پھر دعوت کا سفر ایک فرد(حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا) سے شروع ہوا،پھر قریش میں خفیہ دعوت ہوتی رہی،پھر علی الاعلان ہوئی،پھر آپ حج میں آنے والے قبائل کو دعوت دیتے رہے،پھر طائف گئے،پھر یثرب کے قبیلوں تک پہنچے،کچھ لوگ ایمان لائے تو بات اللہ کے فضل سے بڑھتی گئی۔پہلے آپ نے وہاں اپنا معلم (حضرت مصعبؓ بن عمیر کو) بھیجا۔پھر آخر میں آپ خود وہاں تشریف لے گئے اور اسلامی معاشرہ قائم کیا جو آہستہ آہستہ حکومت (وریاست) کی شکل میں اسٹیبلش ہوگیا۔صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے بعد آپ نے سارے قبائل عرب کو دعوت دی یہاں تک

[۱] جامع ترمذی:۱۸۹۷

کہ ۹ ہجری کو 'عام الوفود' کہا جاتا ہے اور پھر آپ نے اس وقت کے سارے حکمرانوں (روم، ایران، بحرین، اومان، حبشہ وغیرہ) کو دعوت اسلام دی اور جو اسلام لاتے گئے آپ ان کی تعلیم وتزکیہ کا اہتمام کرتے رہے۔

۲۔ اس سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ پہلے فرد کی اصلاح اور پھر نظم اجتماعی (معاشرے اور ریاست) کی اصلاح یعنی پہلے آپ افراد کی اصلاح کرتے رہے اور پھر ان افراد کو معاشرے کی اصلاح کے لیے استعمال کیا جیسے حضرت مصعبؓ کو مدینہ بھیجا اور ۷۰ قراء و مبلغین کو اہل نجد کے مطالبے پر ان کی تعلیم وتربیت کے لیے ان کے ساتھ بھیجا۔ پھر جب یثرب میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متبعین کا مضبوط حلقہ قائم ہو گیا تو انہوں نے آپ کو دعوت دی کہ آپ وہاں تشریف لائیں چنانچہ آپ ہجرت کر کے وہاں گئے اور بتدریج وہاں اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت قائم کر دی۔

یوں قرآن حکیم کی ہدایت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کی ہدایت کے لیے جو منہج پسند فرماتا ہے وہ یہی ہے کہ پیغمبر پہلے افراد پر محنت کرے، پھر جب اللہ اس میں برکت دے اور بہت سے لوگ اسلام قبول کر لیں تو بتدریج اسلامی معاشرہ قائم کیا جائے اور پھر اس معاشرے کو منظم کرتے ہوئے حکومت وریاست قائم کر دی جائے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ فرد کی اصلاح کے بغیر اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست قائم نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے بغیر اگر موقع ملے بھی تو اسے قبول نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی سے پتا چلتا ہے کہ قریش نے حضرت ابو طالب کے ذریعے آپ کو اقتدار کی پیشکش کی تھی لیکن آپ نے قبول نہ فرمائی۔ اسی طرح قبائل عرب میں سے ایک قبیلہ کے سردار نے آپ کا ساتھ دینے کی اس شرط پر رضامندی ظاہر کی کہ آپ آدھا اقتدار اس کو دیں گے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے قبول نہیں فرمایا حالانکہ اس وقت اعانت ودست گیری کے آپ سخت محتاج تھے۔

تو خلاصہ یہ کہ کارِ دعوت، اظہار دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کا اسلوب نیچے سے اوپر کو جاتا ہے یعنی پہلے فرد کی اصلاح وتعمیر، پھر معاشرے کی، پھر حکومت کی۔ دین پر عمل اور اس کے غلبے کی یہی اسلامی، فطری، عقلی اور منطقی ترتیب ہے جسے بدلنا غلط ہے۔

۳۔ اب فرد، معاشرے اور حکومت کی صرف اصلاح ہی مطلوب ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے چودہ سو سال پہلے جو معاشرہ اور حکومت و ریاست [1] قائم کی تھی اس کا تسلسل، الحمد للہ، پچھلے چودہ سو سال سے جاری ہے، لہٰذا صورت یہ نہیں ہے کہ مسلمان معاشرہ موجود نہیں ہے اور ہمیں اسے از سر نو قائم کرنا ہے۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ مسلم ریاست موجود نہیں ہے اور ہم نے اسے از سر نو قائم کرنا ہے۔ بلکہ مسلم معاشرہ بھی موجود ہے اور مسلم ریاست بھی۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ معاشرہ اور ریاست پوری طرح اسلامی نہیں ہے، یہ مثالی اسلامی معاشرہ اور مثالی اسلامی ریاست نہیں ہے، اس میں بہت سی خامیاں اور کمزوریاں ہیں تو اب دعوت واصلاح اور تعلیم وتزکیہ کا تقاضا یہی ہے کہ اس معاشرے اور ریاست کی اصلاح کی جائے، انہیں صحیح اسلامی معاشرے اور صحیح اسلامی ریاست میں ڈھالا جائے۔ تو معاشرہ اور ریاست چونکہ انسانوں سے مل کر بنتے ہیں، انسانوں کا مجموعہ ہوتے ہیں تو ضروری ہے کہ پہلے فرد کی اصلاح کی جائے۔ یہ اصلاح یافتہ افراد معاشرے اور ریاست کی اصلاح کرتے جائیں گے تو ماڈل اسلامی معاشرہ اور ماڈل اسلامی ریاست وجود میں آتی چلی جائے گی۔ ضرورت ہو تو معاشرے اور ریاست کی اصلاح کے لیے الگ ادارے اور تنظیمیں بھی بنائی جا سکتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ افراد کی اصلاح کے بغیر معاشرے اور ریاست کی اصلاح کا تصور بے معنی ہے اور یہ گھوڑے کے آگے گاڑی جوتنے کے مترادف ہے اور اس طریقے سے اصلاح ہونا ممکن ہی نہیں ہے کہ پہلے آپ ریاست کی اصلاح کریں اور پھر ریاست کی قوت سے معاشرے اور افراد معاشرہ کی اصلاح کریں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ افراد کی تیاری اور حمایت کے بغیر آپ ریاست کی اصلاح کیسے کریں گے؟ افراد کی اصلاح کیے بغیر، ان کو ہم خیال بنائے بغیر اور ان کے تعاون وحمایت کے بغیر آپ کو ریاست کا اقتدار ملے گا کیسے؟ اور آپ کو دے گا کون؟ (جاری ہے)

نوٹ: اس تحریر کی دو قسطیں اور ہوں گی۔ جو اصحاب اسے یکجا پڑھنا چاہیں وہ 'البرہان' سے رابطہ کر کے کتابچہ بلا معاوضہ منگوا سکتے ہیں۔

---

[1] یہ بات ذہن میں رہے کہ 'ریاست' مغربی سیاست کی ایک معاصر اصطلاح ہے جس کا اپنا مفہوم ہے جو اپنے عموم میں غیر اسلامی ہے۔ یہ 'اصطلاح' اسلام کے سیاسی نظام میں ہمیں نہیں ملتی بلکہ اس کی جگہ حکومت، امارت، خلافت کے الفاظ ملتے ہیں، ہم اسے یہاں بطور 'غلط العام' استعمال کر رہے ہیں۔

مطالعۂ کتاب	ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

''پاکستان کی دینی قوتیں غیر موثر اور ناکام کیوں۔ایک فکری تجزیہ''

از ڈاکٹر محمد امین

[ڈاکٹر انصاری صاحب کے تبصرے پر میرا مؤقف مضمون کے آخر میں دیا گیا ہے۔مدیر]

اس کتاب میں دینی جماعتوں کے غیر موثر ہونے کے اسباب اور نتائج کا تجزیہ کیا گیا ہے اور ان کو موثر بنانے کے لیے ایک لائحہ عمل مرتب کیا گیا ہے۔ مَیں صرف لائحہ عمل کے ضمن میں چند گزارشات پیش کروں گا۔

ڈاکٹر صاحب کی رائے میں ایک نئی اصلاحی تحریک برپا کیے جانے کی ضرورت ہے جس کے دو بنیادی مقاصد ہوں گے:

* موجودہ دینی تحریکوں کو احساس دلانا کہ وہ اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کریں۔
* ملک کی حالیہ اشرافیہ کو دلائل سے قائل کرنا کہ اصلاح کے لیے نئے خطوط پر کام کرنا ضروری ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی رائے میں اصل کام اصلاح ہے۔انقلاب نہیں ہے۔اصلاح سے بنیادی طور پر وہ ''تلقین'' مراد لیتے ہیں۔اصلاح کا یہ عمل تمام افکار اور اعمال پر محیط ہوگا۔اصلاح کا بنیادی ذریعہ تعلیم ہی ہوگا۔تحریک کا بنیادی مخاطب فرد ہوگا اور فرد کی اصلاح سے یہ توقع کی جائے گی کہ اس کی اصلاح کے لازمی نتیجہ کے طور پر معاشرہ اور ریاست کی بھی اصلاح ہو جائے گی۔معاشرہ اور ریاست کی اصلاح کا ایک محدود تصور پیش کیا گیا ہے جس میں معاشرتی اور ریاستی ادارتی صف بندی کے لیے (مسجد کے علاوہ) گنجائش نہیں۔

فرد کی اصلاح کے لیے دروس وغیرہ سے کام لیا جائے گا۔تعلیمی نظام کی اصلاح اس طرح کی جائے گی کہ دینی اور دنیاوی یکساں تعلیمی نظام مرتب کیا جائے گا۔دنیاوی تعلیم میں معاشیات، ابلاغیات، سیاسیات، بزنس، انجینئرنگ اور میڈیسن شامل ہیں۔دینی اور دنیاوی تعلیم کو مدغم کرنے کے لیے تحریک تلقین بھی کرے گی اور ماڈل اسکول (ماڈل مدرسہ نہیں) اور ماڈل یونیورسٹیاں بھی بنائے گی۔سائنس اور سوشل سائنس کا علوم جاہلیت ہونے کا کوئی تصور اس تصور تعلیم میں موجود نہیں لیکن اس کے مدنظر دینی علوم کو عصر حاضر کے مسائل مرتب کرنے کا ذریعہ بنانے کا تصور موجود ہے

(غالباً اس تصور میں یہ نتیجہ دینی اور دنیاوی علوم کی تزویراتی پیوندکاری سے حاصل ہونے کی توقع کی گئی ہے، واللہ اعلم)۔ میڈیا کو اسلامی اصول واقدار فروغ دینے کا ذریعہ بنانے کی جامع منصوبہ بندی کی جائے گی۔ (اس منصوبہ بندی کی اجمالی نشان دہی نہیں کی گئی)۔

تزکیہ نفس کے ضمن میں بچوں کی تعلیم وتربیت پر زور دیا جائے گا۔ یہ کام ماڈل اسکول بنا کر اور ماڈل اسکول بنانے کی پرائیویٹ سیکٹر کو ترغیب دلا کر کیا جائے گا۔ بڑوں کے تزکیہ نفس کے لیے قرآن وسنت کی تعلیمات، نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور صحابہ کرام اور اسلاف کی سوانح کا مطالعہ کافی ہیں کسی سلسلہ سے وابستگی کی کوئی ضرورت نہیں لیکن بچے کھچے آدمیوں کی مدد سے تصوف کے ادارہ کی تشکیل نو کی جائے گی۔ اور یہ جدید خطوط پر استوار کیا جائے گا۔ اس تشکیل کی بنیاد بھی تعلیم ہی ہوگی۔

تحریک شادی بیاہ، پیدائش اور وفات سے متعلق رسموں کی اصلاح کرے گی۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق ان میں ہندوانہ اثر موجود ہے جس کو ختم کیا جائے گا۔ یہ نہیں واضح کیا گیا کہ کیسے؟ برے اخلاق کے خلاف جدوجہد کا طریقہ واضح نہیں کیا گیا۔ تحریک خدمت خلق کا کام بھی کرے گی اور اس کا طریقہ کار بھی واضح نہیں کیا گیا۔ تزکیۂ نفس کے جاری کام کو ڈاکٹر صاحب غلط اور ناقص کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تصوف کرپٹ ہو گیا ہے لیکن تصوف کی اصلاح کا طریقہ کار بھی واضح نہیں کیا گیا۔

تحریک غربت کے خاتمہ کی کوشش کرے گی۔ حالانکہ کئی ائمہ سیاست (امام ماوردیؒ، امام ابن خلدونؒ، شاہ ولی اللہؒ وغیرہ) نے غربت کے خاتمہ کو اسلامی حکومت کی ذمہ داری نہیں بیان فرمایا۔ غربت کے خاتمہ کے لیے تحریک ایک مرکزی کونسل اور ہر مسجد میں ایک رفاہی کمیٹی منظم کرے گی اور غیر سودی قرضوں اور غیر سودی کاروبار کا بھی اہتمام کیا جائے گا۔ مساجد میں مصالحتی کمیٹی بنا کر ملک بھر میں منظم کیا جائے گا۔ مساجد میں امن کمیٹیاں بھی بنائی جائیں گی جو نوجوانوں اور صحت مند بزرگوں پر مشتمل ہوں گی اور جو تحفظ مساجد اور اسٹریٹ کرائمز کی روک تھام کا کام کریں گی۔ تحریک تفریحی سرگرمیاں مثلاً لائبریری، اسلامی تقریبات اور کھیلوں کو فروغ دینے کی کوشش کرے گی۔ یہ تمام کام غیر سیاسی انداز سے کیے جائیں گے۔ غیر سیاسی سے مراد ہے بغیر نعرہ لگائے بغیر بڑھکیں مارے، بغیر الیکشن لڑے۔ یہ ریاست میں ریاست قائم کرنے کی کوشش نہیں ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب ایک مسلم غیر صالح حکمرانوں کی چلائی گئی حکومت کو اسلامی حکومت تصور کرتے ہیں۔ ان کے بقول دستور میں اسلامی دفعات کی شمولیت کے ذریعہ پاکستانی ریاست نے کلمہ پڑھ لیا ہے وہ غیر صالح مسلمانوں کے اقتدار کو ختم کرنے کی جدوجہد کے قائل ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان غیر صالح مسلمانوں کی اصلاح کی جاسکتی ہے۔ وہ امام عالی مقام اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ کے خروج کو ناکام کہتے ہیں اور ان کے خیال میں غیر صالح مسلمانوں کی چلائی گئی حکومتیں یعنی دہریہ سرمایہ دارانہ ریاستیں ویسی ہی اسلامی ریاستیں ہیں جیسی اموی، عباسی، عثمانی اور مغل سلطنتیں تھیں اور ان غیر صالح مسلمانوں کی چلائی گئی حکومتوں کے خلاف خروجی جدوجہد حرام ہے (خواہ وہ پرامن ہی کیوں نہ ہو)۔

ڈاکٹر صاحب کے مطابق اسلامی سیاسی جدوجہد ہر جگہ ناکام ہوئی ہے۔ پوری کتاب میں کہیں اسلامی جمہوریہ ایران کا تذکرہ ہے نہ ان امارتوں کا جو مجاہدین اسلام آج افغانستان، شام، لبنان، مالی، چیچنیا، صومالیہ وغیرہ میں قائم کرتے رہے ہیں۔ بقول ڈاکٹر صاحب سیاسی جدوجہد کا واحد نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی قوتوں اور غیر صالح مسلم حکمرانوں کی منافرت و مسابقت اور حریفانہ کشمکش عام ہوگئی۔

ڈاکٹر صاحب کی تحریک صالح مسلم حکمرانوں سے مسابقت ختم کردے گی اور ان کی اصلاح کی کوشش کرے گی۔ یہی درس وہ اسلامی دینی جماعتوں کو بھی دے گی۔ یہ تحریک اسلامی دینی سیاسی جماعتوں کو جمہوری عمل سے باز رکھنے کی کوشش کرے گی۔ وہ غیر سیاسی اسلامی جماعتوں کو بھی غیر صالح مسلم حکمرانوں کی اصلاح پر آمادہ کرے گی۔ غیر صالح مسلم حکمرانوں کی اصلاح کے لیے جو اقدام تحریک جاری کرے گی وہ حسب ذیل ہیں:

- ایچی سن کالج جیسے ادارے قائم کرے گی جو ایلیٹ بچوں کی تربیت کریں گے۔
- بیوروکریسی اور فوج کے تربیتی اداروں کی اصلاح کرنا۔ (طریقہ کار واضح نہیں)
- سرکاری مقابلہ کے امتحانوں میں امیدواروں کی تیاری
- ارکان اسمبلی کی پروفیشنل تربیت (اس سے واضح ہوتا ہے کہ گو کہ تحریک جمہوری عمل میں شرکت سے اسلامی جماعتوں کو روکے گی وہ جمہوری عمل کے تسلسل کو جائز گردانتی ہے)
- فائیو اسٹار ہوٹلوں میں مینجمنٹ اور فنانس کے لیے ورکشاپ منعقد کرے گی۔

ڈاکٹر صاحب کے مطابق حضرت مجدد الف ثانی نے یہی کیا تھا اور آپ کی مساعی جلیلہ سے

جہانگیر کی اصلاح ہوگئی تو بلاول بھٹو کی کیوں نہیں ہوسکتی جب کہ مغل سلطنت اور پاکستان ایک ہی قسم کی حکومتیں ہیں۔

دینی اسلامی جماعتوں کے ارکان کو مشورہ دے گی کہ وہ دہریہ جماعتوں میں شامل ہوجائیں اوران کی قیادت کی اصلاح کریں۔

تنظیم اسلامی، تحریک اسلامی اور ایسی سیاسی اسلامی جماعتوں کو جو انتخابات میں حصہ نہیں لیتیں اکٹھا کیا جائے۔اور ایک غیر انتخابی پریشر گروپ بنائے گی جو وقتاً فوقتاً خاص ایشوز پر احتجاج اور مطالبات کرتا رہے گا۔

اسلام کے سیاسی نظام کی اجتہادی انداز سے تشکیل نو کی جائے گی (طریقہ کار واضح نہیں)

تجزیہ

میں ایک ایسا جاہل شخص ہوں جو صرف ناظرہ قرآن مجید پڑھا ہوا ہے۔لہٰذا اب میں جو کچھ عرض کروں گا وہ ایک ناخواندہ شخص کی خام خیالی کا اظہار ہے۔

میں جماعت اسلامی کا ایک عام کارکن ہوں اور ہم ڈاکٹر امین صاحب کو اپنے فکری قائدین میں شمار کرتے ہیں۔آپ نے تحریک اصلاح تعلیم کے ضمن میں جو کام کیا ہے وہ دور حاضر میں عدیم المثال ہے۔اور ہم اس سے مستقل مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

اسلامی حکمت عملی کے ضمن میں آپ نے جو تجاویز پیش فرمائی ہیں ان میں دینی اور دنیاوی نظام تعلیم کے ضمن کی تجاویز قابل قدر ہیں اور جماعتوں سے وابستہ اسکولوں، مدرسوں اور کالجوں کو ان تجاویز کی تنفیذ کے لیے غور اور اہتمام کرنا چاہیے۔

اسی طرح مساجد کے دائرہ کار کو وسعت دینے کی تجاویز بھی نہایت مفید ہیں اور اس قسم کا کام اسلامی جمہوریہ ایران میں مدت سے ہورہا ہے جس کے مثبت معاشرتی نتائج برآمد ہورہے ہیں۔ائمہ مساجد کو فطری عوامی مقامی قائد کے طور پر فائز کئے بغیر تحریک غلبہ دین مخلصین دین کو بااقتدار نہیں بنا سکتی۔

ڈاکٹر صاحب کو اس بات کا احساس ہے کہ مساجد کے معاشرتی کردار کو وسیع کرنے کے کام کی دہریہ قوتیں لازماً مخالفت کریں گی اور یہ مخالفت لازماً سیاسی ہوگی۔پھر پریشر گروپس سے جو توقعات ڈاکٹر صاحب قائم کرتے ہیں ان کے بروئے کار لانے کے لیے بھی سیاسی عمل ہی

ضروری ہوگا۔لہٰذا اصلاحی تحاریک سیاسی مسابقت سے لاتعلق نہیں رہ سکتیں۔

اسلامی تاریخ میں اصلاحی اور انقلابی جدوجہد عموماً مربوط رہی ہے۔ اصلاح اور انقلاب complimentary عمل ہیں، متبادل (substitute) عمل نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے دور میں محض ایک مدرس اور مزکی نہیں تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ایک سیاست دان، ایک منصف، ایک منتظم بھی تھے۔مسلمانوں نے آپ کو اپنا حاکم اعلیٰ تسلیم کرلیا تھا اور مکہ میں قائم پارلیمنٹ (ندوہ) کا مکمل بائیکاٹ کیا تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ اور تعلیم کے ذریعہ مکہ کی ایلیٹ کی اصلاح نہیں ہوئی۔ مکہ کو فتح کرنے کی ضرورت پڑی اور اس کے لیے ہجرت اور جہاد کے مراحل سے گزرنا پڑا اور ہجرت اور جہاد دونوں فی نفسہ سیاسی عمل ہیں۔

پھر پوری اسلامی تاریخ میں خروجی تحریکات جاری رہی ہیں۔ امام عالی مقام اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے خروج نہایت کامیاب خروج تھے۔ان کی مساعی جلیلہ کے نتیجہ میں اسلامی حکومتوں میں تیرہ سو سال تک (خلافت عثمانی کے سقوط تک) ہمیشہ شرع نافذ رہی اور تمام اجتماعی فیصلے علوم اسلامی کے تناظر میں کیے جاتے رہے۔سلاطین عموماً علما کرام کے معتقد اور صوفیا عظام کے مرید رہے اور معاشرتی، عدالتی، تنظیمی اور تعلیمی نظام پر علما کی حاکمیت مسلم رہی۔

اور جیسا کہ امام ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ نے "مقدمہ" میں واضح فرمایا ہے سیاسی نظام میں بگاڑ کی درستی کے لیے سلاطین کے خانوادوں سے ہمیشہ مزاحمت ہوتی رہی۔حقیقت یہ ہے کہ ہمارے درخشاں تاریخی دور میں اسلامی انقلابی سلاطین ہی تھے۔ برصغیر میں سب سے روشن مثال امام اورنگ زیب رحمہ اللہ کے دارا شکوہ ملعون اور شاہجہاں کے خلاف کامیاب خروج کی ہے۔پوری انیسویں صدی میں برصغیر میں خروج اور جہاد جاری رہا اور اکابر علما اور سلاطین سید بادشاہ، صادق پوری سید، حیدر علی، حاجی شریعت اللہ، حافظ رحمت خاں، نواب نجیب الدولہ، شیخ المشائخ حضرت امداد اللہ مکی، امام فضل اللہ خیر آبادی، مولانا محمود حسن، جنرل بخت خاں، حاجی ترنگ زئی، پیر صبغت اللہ مجددی، فقیر اپی، حاجی ترنگ زئی وغیرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان خروجوں کی قیادت فرمائی۔

یہ تحاریک پسپا تو ہوئیں ناکام نہیں ہوئیں۔آج ملک میں غلبہ دین کی جدوجہد جاری ہے وہ ان ہی مہمات کا تسلسل ہے۔ یہ سب امام عالی مقام کا صدقہ جاریہ ہے اور ہماری جماعت بھی انہی بزرگوں کی غلامی کا شرف حاصل کرنے کی جستجو کررہی ہے اور ہمیں امید ہے کہ

حضور شافع محشر کہیں گے یوں شبیر
گناہ گار تو ہے پر جماعت میری ہے

پاکستان کی دینی سیاسی تحریکیں غیر موثر تو ہیں ناکام نہیں ہیں۔ وہ سرمایہ دارانہ طرز حیات اور نظام زندگی کے خلاف جدوجہد کر رہی ہیں اور یہ ایک ایسا طویل المدت اقدام ہے جو صدیوں تک جاری رہے گا۔ پاکستان کی ریاست ایک خالصتاً دہریہ، سرمایہ دارانہ، سامراجی باجگزار ریاست ہے۔ اس کے حکمران سامراج کے آلہ کار ہیں۔ وہ اپنے سامراجی آقاؤں کے مطیع اور فرماں بردار ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی اصلاح کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اس ضمن میں جو تجاویز ڈاکٹر صاحب نے دی ہیں ان پر کسی نہ کسی حد تک عمل کیا جارہا ہے اور کیا جاتا رہنا چاہیے۔

لیکن ان تجاویز کی تنفیذ سے نظاماتی تغیر کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ عملاً ان تجاویز کی تنفیذ کے نتیجہ میں ایک مدت دراز میں (جس کا تعین ڈاکٹر صاحب نے نہیں کیا) ریاستی اشرافیہ کا ایک قلیل گروہ اصلاح سے متاثر ہوگا۔ لیکن اس گروہ نے تحکیم قانون سرمایہ کو معطل کرنے کی جدوجہد کی تو اس کی سیاسی اور غالباً عسکری مخالفت سامراج اور سرکاری اشرافیہ کی بڑی اکثریت لازماً کرے گی اور لامحالہ ملک میں سیاسی کشمکش جاری رہے گی۔ سامراجی گماشتوں سے مخلصین دین کی طرف قوت کا انتقال اپنی نوع کے اعتبار سے ایک سیاسی عمل ہے جو محض تلقین سے انجام نہیں دیا جاسکتا۔

بحیثیت مجموعی یہ کتاب چشم کشا ہے اور مصلحین کے کام کو آگے بڑھانے لیے نہایت مفید مواد فراہم کرتی ہے۔ اصلاح کے کام کو انقلابی عمل کا متبادل نہیں سمجھنا چاہیے۔ اصلاح اور انقلاب ایک سکہ کے دو رخ ہیں اور اصلاحی اور انقلابی جدوجہد کو مربوط کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ ہماری جماعت تمام مصلحین جماعتوں کی حمایتی، قدردان اور خادم جماعت ہے۔ ہم ڈاکٹر امین کو اپنے رہنماؤں میں شمار کرتے ہیں۔

مدیر البرہان کا موقف

۱۔ راقم ایک بات ابتداء ہی میں عرض کردے کہ ڈاکٹر انصاری صاحب محترم نے اس مضمون میں کئی ایسی باتیں اس سے منسوب کی ہیں جو اس نے نہیں کہیں یا جو اس کا مقصود نہیں تھیں۔ اس کے کئی سبب ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ڈاکٹر انصاری صاحب جس فکر کے حامل ہیں، اس پر میں نے اس کتاب میں بوجوہ تفصیل سے قلم نہیں اٹھایا اور اجمال کا مخل فہم ہونا ظاہر ہے۔ دوسرے یہ کہ پاکستان کی دینی قوتوں کے اختیار کردہ مناہج میں خامیوں کی نشاندہی کے بعد میں

نے ان کی اصلاح کے لیے جس ''اصلاحی تحریک'' کی تجویز پیش کی تھی، مَیں عمداً اس کے مبادی تک محدود رہنا چاہتا تھا اور تفصیلات کو مؤخر کرنا چاہتا تھا تا کہ ان پر مجھے بھی مزید سوچ بچار کا موقع مل جائے اور اگر اہل علم میں سے کچھ لوگ اس تجویز کو اصولاً قبول کر لیں تو انہیں بھی اس میں شریک کر لیا جائے۔ اس کی تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ انسانی نفسیات ہے کہ جس رائے سے وہ اختلاف رکھتا ہو، اسے غلط سمجھتا ہو وہ اسے نامانوس لگتی ہے۔ وہ کانوں سے سنتا ہے لیکن وہ بات دماغ میں نہیں ٹکتی، نہیں جمتی گویا سُنی اَن سُنی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے محاورہ ہے کہ ایک کان سے سنی دوسرے سے نکال دی۔ یہ کام بعض اوقات لاشعوری طور پر بھی ہوتا ہے۔

۲۔ یہ ڈاکٹر انصاری صاحب کی عالی ظرفی ہے کہ انہوں نے شروع میں ہی یہ تسلیم کر لیا کہ وہ دین کے عالم نہیں ہیں۔ بظاہر دیکھا جائے تو اس کے بعد بحث کا دروازہ بند کر دینا چاہیے کیونکہ یہ بہت سنجیدہ علمی بحث ہے جس کا مدار دینی استدلال اور قرآن وسنت سے استنباط پر ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب جیسا پڑھا لکھا آدمی جس نے پاکستان میں غلبۂ دین کے بارے میں کئی کتابیں لکھی ہیں ظاہر ہے ان کا کچھ نہ کچھ فکری ماخذ تو ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہو سکتا جیسا ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں علی الاعلان اس کا اظہار کرتے ہیں اور اس تبصرے میں بھی کیا ہے کہ وہ جماعت اسلامی کے کارکن ہیں۔ گویا ان کی دینی فکر وہی ہے جو مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کی ہے۔

۳۔ ڈاکٹر انصاری صاحب اپنے تبصرے میں کہتے ہیں: ''ڈاکٹر (امین) صاحب کی رائے میں اصل کام اصلاح ہے، انقلاب نہیں ہے'' ہماری اصلاحی تجاویز کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: ''ان تجاویز کی تنفید سے نظاماتی تغیر کی توقع نہیں کی جاسکتی''۔ مزید کہتے ہیں: ''سامراجی گماشتوں سے مخلصین دین کی طرف قوت کا انتقال اپنی نوع کے اعتبار سے ایک سیاسی عمل ہے جو محض تلقین سے انجام نہیں دیا جاسکتا'' اور تان اس بات پر آ کر توڑتے ہیں کہ ''اصلاح کے کام کو انقلابی عمل کا متبادل نہیں سمجھنا چاہیے۔''

یہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ راقم کے نزدیک اسلام میں اصلاح کا جو تصور ہے اس کی دوبارہ وضاحت کر دے کہ اس میں سیاسی عمل اور حکومت وریاست کے معاملات بشمول اظہارِ دین شامل ہیں اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ ڈاکٹر صاحب کی 'انقلاب' اور 'انقلابی عمل' سے کیا مراد ہے اور اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (جاری ہے)

تبصرۂ کتب　　　مدیر

کتاب نما

'جماعت اسلامی۔کل اور آج' از چوہدری محمد یوسف ایڈوکیٹ

گوجرانوالہ کے چوہدری محمد یوسف صاحب ایڈوکیٹ جماعت اسلامی کے سابق رکن ہیں۔انہیں جماعت اسلامی اور اس کے مقاصد سے اتنی محبت ہے کہ وہ آج بھی اس میں شامل ہونا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنا چاہتے ہیں۔

چوہدری صاحب کی کتاب اس لحاظ سے خاصی منفرد ہے کہ وہ جماعت اور مولانا مودودی علیہ الرحمہ کی فکر پر کوئی نقد نہیں کرتے بلکہ اسے صحیح سمجھتے ہیں۔ان کی رائے میں جماعت کی بنیادی خامی اور اس کی ناکامی کا سبب اس کی داخلی تنظیم اور اس کا تنظیمی ڈھانچہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جماعت میں جمہوریت صرف دکھاوے کی ہے اور صرف انتخاب امیر تک محدود ہے۔ جماعت کا باقی سارا نظم اوپر سے نیچے تک انتخاب کی بجائے تعیناتیوں پر مبنی ہے اور وہ خاصا آمرانہ ہے۔ان کی رائے میں شوریٰ بھی اسی لیے مؤثر نہیں ہو سکتی کہ وہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو اضلاع میں مرکزی نظم کے زیر اثر ہوتے ہیں۔

راقم الحروف جماعت کا محب اور خیر خواہ ہونے کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ جماعت میں ایسا علمی وفکری ماحول ہونا چاہیے جو اس طرح کی مخلصانہ تنقید کا بھرپور جائزہ لے اور اگر اس میں وزن پائے تو اس سے استفادہ کرے۔

چوہدری صاحب کو غالباً کتابوں کی طباعت کا کوئی تجربہ نہیں اور انہیں کوئی صحیح مشورہ دینے والا بھی نہیں ملا کیونکہ ان کی کتاب اتنے باریک خط میں کمپوز کی گئی ہے کہ اسے پڑھنا بہت مشکل ہے۔ظاہر ہے جب کتاب پڑھی ہی نہیں جاسکے گی تو اس سے استفادہ کوئی کیسے کرے گا؟

۱۹۲ صفحات کی یہ کتاب اخوان پبلی کیشنز، ا۔ جہانگیر کالونی، کھوکھر کی، گوجرانوالہ سے طلب کی جاسکتی ہے۔ قیمت ۵۰۰ روپے۔

فون نمبر 0331-460264　　0334-8103636

CPL No. 296 February 2021

ڈاکٹر محمد امین کی نئی کتاب

إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ

اصلاحِ دینی مدارس

ڈاکٹر محمد امین

صفحات: ۳۵۲ قیمت: ۴۰۰ روپے (بغیر ڈاک خرچ)

مکتبہ البرہان

A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@outlook.com